قرآن وسنت

چند مباحث ۲

حافظ احمد یار خانؒ

شیخ زاید اسلامک سینٹر، جامعہ پنجاب، لاہور

۱۹۰۵۶۱۹
۹۲۹۷۵

جملہ حقوق محفوظ

کتاب : قرآن وسنت۔چند مباحث ۲

مؤلف : پروفیسر حافظ احمد یار خانؒ

ناشر : پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت

ڈائریکٹر، شیخ زاید اسلامک سینٹر، جامعہ پنجاب، لاہور

تعداد : ۵۰۰

سن اشاعت : ستمبر، ۲۰۰۱ء

قیمت : ۱۰۰ روپے

Marfat.com

محتویات

صفحہ

وحدت ملی کی اساس۔قرآن مجید	1
قرآن کریم اور ضمیر بیدار	9
عظمت قرآن۔ایک اور پہلو	19
خدمت قرآن کے میدان	34
قرآنی ادب وثقافت کا ایک پہلو	50
حفاظت متن قرآن	64
کتابت مصاحف میں علامات ضبط کا تنوع	117
کتابت مصاحف میں صنائع وبدائع	127
نوع انسانی کا معلم اعظمؐ	142
نبی اکرمؐ اور مکارم اخلاق	156
اسلام کا رہنمائی نظام	164
Moral Excellence	1
Our Duty Towards the Qur'an	5

ابتدائیہ

پروفیسر حافظ احمد یار صاحب مرحوم کے علمی مقام کے اعتراف اور ان کی قلمی میراث کے تحفظ کے لیے ان کے نتائج قلم پر مشتمل ایک مجموعہ مقالات ''قرآن وسنت۔ چند مباحث'' کے عنوان سے شیخ زاید اسلامک سینٹر جامعہ پنجاب لاہور کے زیر اہتمام گزشتہ سال شائع ہو چکا ہے۔ ان مقالات کا سنجیدہ علمی حلقوں میں حوصلہ افزا انداز میں خیر مقدم کیا گیا۔

بعد ازاں قرآن وحدیث سے متعلق ------- جو حافظ صاحب کی دلچسپی کے مرکزی میدان تھے ------- ان کے کچھ اور مضامین سامنے آئے جن میں سے بیشتر کی بہم آوری ہماری عزیز طالبہ عابدہ (ایم اے۔ اسلامیات) کی محنت سے ممکن ہوئی۔ چونکہ یہ سارا مواد سینٹر کی سابقہ جدوجہد کے تسلسل میں تھا اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ حافظ صاحب کے یہ مقالات بھی ''قرآن وسنت۔ چند مباحث۔۲'' کے عنوان سے سامنے آجائیں۔ امید ہے کہ حسب سابق اسلامک سینٹر کی اس اشاعت کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

جمیلہ شوکت

ڈائریکٹر شیخ زاید اسلامک سینٹر

پنجاب یونیورسٹی لاہور

Marfat.com

Marfat.com

وحدت ملی کی اساس — قرآن مجید

حامداً ومصلیا و مستعیذاً "واعتصموا بحبل اللّٰہ جمعیاً ولا تفرقوا" (ال عمران/۱۰۲)

انسانی غور وفکر کے نتیجے میں اب یہ بات ایک سائنسی نظریہ کی صورت میں سامنے آچکی ہے کہ عالم موجودات اور اس نظام کائنات میں ہر چھوٹی بڑی شے کا وجود اس کے مرکز سے وابستہ ہے۔ ذرہ (Atom) کا وجود ایک مرکز (Nuclear) سے وابستہ ہے۔ زمین اور اس پر رہنے والی مخلوقات کی زندگی مرکزی کشش ثقل کے سہارے قائم ہے۔ نظام شمسی ایک مرکز کی بنا پر استوار ہے اور اسی طرح بات آگے کہکشاں تک پہنچتی ہے۔

ذرہ سے لے کر نظامہائے کہکشاں (Galactic System) تک ہر جگہ اپنے اپنے مرکز کے گرد طواف کا ایک منظر پایا جاتا ہے۔ مرکز سے ٹوٹ جانے یا مرکز سے بے تعلق ہو جانے کے نتیجے میں تباہی اور بربادی ظہور میں آتی ہے۔

یہ مقالہ مرکزی انجمن خدام القرآن کی دس سالہ تقریب کے ضمن میں "اسلام معاشرہ اور قرآن حکیم" کے موضوع پر ۱۲ نومبر ۱۹۸۲ء کو جناح ہال لاہور میں پڑھا گیا

چیست وحدت؟ جز وجودِ مرکزے
زندہ ہر شے در حدود مرکزے!!
ذاتِ شے بر ذرہ باشد منقسم
ذرہ مارا مرکزے دارو بہم
ذرہ ذرہ سوئے مرکزے می رود
آیون آیون(۱) گردیک مرکز دود
ثابت و سیارگان رامرکز است
قطب را و کہکشاں رامرکزے است
ہر یکے بینی بعشقے در طواف!!
کے کند از مرکزؑ خود انحراف
ہر نظامے راست مرکز در جہاں
مرکزے دارد ہم این کون و مکان
گر کسے از مرکزش رو تافتے
نام خود ہم گم زہستی یافتے
ہر کہ دوراز محورش مائل شود!!
چوں شہا بے ہستی اش زائل شود
(مثنوی صمدائی)

جس طرح عالم حسی و طبیعی میں اشیاء کا وجود مختلف درجات میں کسی نہ کسی مرکز سے مربوط ہے۔ اسی طرح اشخاص و اقوام کا معنوی وجود بھی ہمیشہ کسی مرکز سے وابستہ ہوتا ہے۔

یہ معنوی مرکز ہی اس کی بقاء اور اس کی تعمیر و ارتقاء کے لیے ایک مضبوط اساس مہیا کرتا ہے۔ اقوام و ملل میں اسی مرکز سے وابستگی کے باعث ایک احساسِ یک جہتی پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی احساسِ یک جہتی یا اخوت و اتحاد ایک ملت یا قوم کو دوسری ملتوں اور قوموں سے ممتاز کرتا ہے۔

---

(۱) مراد ہے آئیونک تھیوری (Ionic Theory)

Marfat.com

اسلامی نقطۂ نظر سے تمام انسان دو ملتوں میں منقسم ہیں۔ یعنی اسلام کا نظریہ ملت درحقیقت دو قومی نظریہ ہے۔ ایک طرف ملت اسلامیہ اور دوسری طرف الکفر ملۃ واحدہ ...... عجیب بات ہے کہ آج مسلمانان عالم یا کم از کم ان کی خود ساختہ قیادتیں وقت کے شدید ترین امتحانات کے باوجود اپنے آپ کو ایک اور صرف ایک ملت سمجھنے سے قاصر ہیں یا کم از کم وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں نظر آتے۔ دوسری طرف وہ "ملت کفر" کو ملت اسلامیہ کے مقابل عداوت مسلم پر متحد و متفق ایک ہی ملت سمجھنے کی بجائے کسی دوسری ملت کافرہ سے "امید غم گساری" رکھتے ہیں۔ کوئی ماسکو کے سہارے زندگی کی تلاش میں ہے اور کوئی واشنگٹن کی مہربانی کو اپنے لیے درازی عمر کا بہانہ خیال کیے ہوئے ہے۔ کوئی ایک سپر پاور کے دروازے پر حاضر ہے تو کوئی دوسری سپر پاور کی دہلیز پر۔ اس سے عجیب تر بات یہ ہے کہ مسلمان تو اپنی وحدت اور کفر کی وحدت کی تصور سے ناآشنا نظر آتے ہیں۔ مگر غیر مسلم یا "ملت کفر" تمام مسلمانوں کو ایک ہی ملت سمجھ کر اسے معدوم کرنے یا محکوم بنانے کی مساعی میں ایک متفقہ پروگرام پر عمل پیرا نظر آتی ہیں۔

ہنود و یہود اور روس و امریکہ سب عداوت مسلم پر متحد ہیں۔ لبنان ہو یا افغانستان، صومالیہ ہو یا ہندوستان، ارٹیریا ہو یا فلپائن ہر جگہ خون مسلم کی ارزانی دیکھیے! اور یہی نہیں کہ صرف غیر ہی ان کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ مسلمان خود بھی وحدت ملت کے تصور کو پس پشت پھینک کر اپنے اپنے [illegible] سے وفاداری کی خاطر آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ رہے ہیں۔ ایران، عراق اور صحراؤں میں کون کس کو مار رہا ہے؟ اور کس کے لیے؟ آج [illegible] لاکھ بے خانماں جلاوطن مسلمان دنیا کے مختلف ملکوں میں دھکے کھاتے پھرتے

ہیں.....یا مہاجر کیمپوں میں اپنے بڑوں کی غلطیوں کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔

الم یان للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ وما نزل من الحق ولا یکونوا کالذین اوتوا الکتاب من قبل فطال علیھم الامد فقست قلوبھم وکثیر منھم فاسقون

(الحدید:١٦)

آج اگر ملت اسلامیہ کی سیاسی وحدت وطن، نسل، رنگ، زبان وغیرہ کے مراکز میں بٹ کر رہ گئی ہے تو ان کی دینی وحدت بھی چند مخصوص کلامی اختلافات اور فقہی مذاہب کو ہی اساس وحدت سمجھ لینے کی بنا پر فرقوں اور مسالک میں تقسیم ہوگئی ہے۔ اور سب آپس میں دست و گریباں ہیں.....سیاسی معاملات ہوں یا دینی توجیہات ہر جگہ اختلافات "رحماء بینھم" سے گزر کر "بغیابینھم" کے نشان خطرہ(Danger Point) سے متجاوز ہوتے نظر آتے ہیں۔

مسلمان غالبًا اپنی تاریخ کے کسی دور میں بھی وحدت ملت کے تصور سے اتنا منحرف اور اس کا اتنا محتاج کبھی بھی نہیں ہوا جتنا آج ہے۔

ملی وحدت کے لیے اور اتحاد کے لیے ایک مضبوط اساس یا ایک ایسے قوی مرکز کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس میں نہ صرف تمام اجزائے ملت کو مرکز ملت کی طرف کھینچنے کی زبردست قوت موجود ہو بلکہ جو منتشر اور متفرق کرنے والی تمام قوتوں پر غالب بھی آسکے۔

آج یہ بات کرنا تو کوئی انکشاف نہیں کہ ملت اسلامیہ کی اساس وطن، نسل و رنگ، زبان یا کسی اور مشترکہ وقتی مفاد پر نہیں ہے۔ ملت اسلامیہ کی اساس دین اسلام ہے۔

قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
(اقبال)

مگر خود دینِ اسلام کی صحیح پہچان اور شناخت اس کے اپنے مرکز کے حوالے سے ہی ہوسکتی ہے۔ اس لیے کہ بقول مولانا رومؒ۔

دیں بگیرد بدعتی بدعت شود
کفر گیرد کاسے ملت شود

ملت کی اساس دین اور دین کی اساس کتاب و سنت ہے۔ کتاب و سنت میں ہی ایک خدا، ایک رسولؐ ایک کتاب، ایک قبلہ اور ایک امت کا تصور موجود اور شامل ہے۔ بلکہ یہی ایمان کا مقصود ہے۔

پھر کتاب و سنت میں بھی سنت کی حیثیت کتاب کے اولین اور معتبر ترین شارح کی ہے جس کے بغیر فہم قرآن کی کوئی کوشش گمراہی سے اور جس کے بغیر ذات رسولؐ سے عشق و وفاداری کا کوئی ادعا امکان کذب سے محفوظ نہیں ہے۔

ان معنوں میں دین کی اصل اساس قرآن کریم ہے اور اسی کو وحدت ملت اسلامیہ کی صحیح ترین اور مضبوط ترین اساس قرار دیا جا سکتا ہے۔

وحدت ملی کے ساتھ قرآن مجید کے اس اساسی اور بنیادی تعلق کی مزید وضاحت خود قرآن کریم کی بعض آیات سے ہوتی ہے۔ مثلاً

ا۔ واعتصموا بحبل اللّٰہ جمعیا و لا تفرقوا (اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور باہم نا اتفاقی میں نہ پڑو) میں "حبل اللہ" کی تفسیر مفسرین نے قرآن، اسلام، عہداللہ، جماعت، اطاعت اور توحید سے کی ہے۔ تاہم اکثر نے اس سے کتاب اللہ یا قرآن کریم ہی مراد لیا ہے۔

i) ابن جریر نے کتاب اللہ سے معنوں کی تائید میں پانچ مختلف طرق اور اسناد سے روایت بیان کی ہے۔

ii) حافظ ابن کثیر نے حضرت ابوسعید خدریؓ کے حوالے سے "حبل اللّٰہ" سے مراد قرآن مجید" لیا ہے۔

هو حبل اللّٰه الممدود من السماء الى الارض .....

كالحبل الذى يتمسك به خشية السقوط۔

احمد محمد شاکر نے ابن کثیر کی تلخیص میں اس روایت کو سنداً ضعیف مگر معناً صحیح اور ثابت قرار دیا ہے اور شواہد کے طور پر کچھ اور روایات کا حوالہ بھی دیا ہے۔ از انجملہ مسلم (کتاب فضائل صحابہ) کی یہ عبارت بھی نقل کی ہے:

انى تارك فيكم ثقلين احد هما، كتاب اللّٰه وهو حبل اللّٰه

من اتبعه كان على الهدى ومن تركه كان على ضلالة

شیعہ مفسر طبرسی نے چار مختلف روایات کے ذریعے "حبل اللّٰہ" سے قرآن کریم مراد لئے جانے کا ذکر کیا ہے۔ اگرچہ اپنے مسلک کی بناء پر اس نے "اهل بيت" کو بھی اس میں شمار کر ڈالا ہے۔

تفسیر "المنار" میں "حبل اللّٰہ" کی تفسیر قرآن مجید سے کرنے کو قول مختار قرار دیا گیا ہے۔اس لیے بھی کہ باقی سب معانی خودبخود اس میں شامل ہیں۔ صاحب المنار مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"هو (یعنی اللّٰہ) اوجب علينا ان نجعل اجتماعنا و وحدتنا بكتابه عليه نجتمع وبه نتحد لا بجنسيات نتبعها ولا بمذاهب نبتدعها ولا بموا صفات نصنعها ولا بسياسات نخترعها ثم نهانا (اللّٰه) من ا لتفرق والانفصام بعد هذا الايضاح والاعتصام لما فى التفرق من زوال الوحدة"

یہ بھی قابل غور ہے کہ یہ آیت اسلام کے نظریہ وحدت ملت کے ایجابی اور سلبی دونوں پہلوؤں کو شامل ہے۔ واعتصموا ... اور لا تفرقوا

(۲) اتحاد وحدت ملت کے لیے تالیف بین القلوب نہایت ضروری ہے۔ سورہ آل عمران اور سورہ الانفال میں اللہ تعالیٰ کی اعداء کے دلوں کو باہم جوڑنے کے اس عمل کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

i) اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخوانا۔

(آل عمران: ۱۰۳)

ii) ھو الذی ایدك بنصرہ وبالمومنین والف بین قلوبھم لو انفقت ما فی الارض جمیعاً ما الفت بین قلوبھم ولکن اللّٰہ الف بینھم

(الانفال: ۶۲-۶۳)

سورہ آل عمران ہی کی اس آیت سے پہلے ایک آیت میں اعتصام باللہ (اللہ کو مضبوط پکڑنا) کو حصول ہدایت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ ومن یعتصم باللہ فقد ھدی الی صراط مستقیم ... اور آگے اس اعتصام باللہ کا ہی حکم واعتصموا بحبل اللّٰہ کے الفاظ میں دیا ہے۔

پوری ملت میں تالیف بین القلوب یا دل جوڑنے کا یہ کام قرآن حکیم کتاب اللہ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

فرقہ وارانہ باتوں سے کسی ایک فرقے میں شاید تالیف بین القلوب کا کام لیا جا سکے۔ اور وہ بھی منفی انداز میں۔ مثبت اور تعمیری انداز میں ملت گیر پیمانے پر تالیف بین القلوب قرآن کے نام پر اور اسلام کے نام پر ہی ممکن ہے اور اس کا مظہر اصل قرآن کریم ہی ہے اور وہی "تکمیل القوم" کی طرف رہنمائی کرنے والی کتاب ہے۔

Marfat.com

۳۔ قرآن کریم کے بارے میں قران کریم میں ہی وعدہ حفاظت الٰہی مذکور ہے۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون۔(الحجر:۹)

لہذا کہا جاسکتا ہے کہ اساس قرآنی پر مبنی وحدت ہی محفوظ اور پائیدار وحدت ہوگی۔ اس لیے کہ اس اتحاد یا وحدت کی بنیاد کسی وقتی مصلحت یا کسی منفی مفاد پر نہیں ہوگی۔

ہم جانتے ہیں کہ لوگوں نے قرآن مجید کو بھی اپنی اغراض و ہوائے نفس کے تحت تحریف معنوی کا نشانہ بنایا ہے۔ خدا و جبریل و مصطفیٰ کو دم بخود کر دینے والی تاویلات بھی کی گئی ہیں۔ خود بدلنے کی بجائے قرآن کو بدل دینے والے فقیہان حرم بھی موجود ہیں۔

اے بسا عالم زقرآں حرف جواست
دین حق ہفتاد و دو فرقہ ازوست

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن مجید کے نہ صرف الفاظ و حروف میں کوئی ادنی تغیر واقع نہیں ہوا۔ بلکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جس طرح سمجھا اور نافذ کیا اور جس طرح اس پر خود عمل کیا اور دوسروں سے عمل کرایا اس کی تمام تر تفصیلات کا ریکارڈ بھی موجود ہے جو اتباع شہوات پر مبنی تمام آراء و تاویلات کے لیے پڑتال اور احتساب کا کام دیتا ہے۔

اور چونکہ اللہ تعالی نے قرآن کریم کی لفظا اورمعنا حفاظت اپنے ذمہ لی ہے۔ اس لیے قرآن ہی وحدت ملت کی سب سے محفوظ اور محکم ترین اساس ہے قرآن کو چھوڑ کر کسی اور شے پر ملت استوار کرنے کی کوشش کا انجام "فانهاربه فی نار جهنم" ہی ہوسکتا ہے۔

Marfat.com

قرآن کریم اور ضمیر بیدار

حمد و صلوۃ کے بعد ..... إن كل نفس لما عليها حافظ

(الطارق:٤)

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جن باطنی قوتوں سے نوازا ہے ان میں سے دل و دماغ یا عقل و ضمیر دو نہایت اہم قوتیں ہیں۔ جس طرح بیرونی حواس کا فقدان یا ان کی صحت و سقم انسان کی مادی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کی ان اندرونی طاقتوں کی صحت و قوت یا ان کا فساد و ضعف اس کی اخلاقی و روحانی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اور بالآخر اس کی اُخروی زندگی میں سعادت و شقاوت اور فلاح یا خسارہ کا باعث بنتا ہے۔ ہمارا آج کا موضوع لفظ "ضمیر" اگرچہ عربی زبان ہی کا لفظ ہے جو انسان کی باطنی و قلبی کیفیت اور داخلی شعور کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے تاہم قرآن کریم میں یہ لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا ..... اردو اور عربی میں اب یہ لفظ "ضمیر" عام طور پر انگریزی لفظ (Conscience) کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔ جو انسان کی ایک اہم باطنی کیفیت یا قلبی استعداد Faculty of mind بلکہ Highest Faculty of Mind کے طور پر فلسفہ و نفسیات والوں کا ایک خاص موضوع ہے۔ گویا اسے ایک ایسی اندرونی استعداد یا قوت سمجھا جاتا ہے جو بصورت صحت خود انسانی حواس و احساسات اور ہیجانات کے زیر اثر رونما ہونے والی لغزشوں پر قابو پانے کی

صلاحیت رکھتی ہے۔ جنہیں اصطلاحاً Temptation کہا جاتا ہے۔ نفسیات والوں کے نزدیک ہر دو (یعنی) Conscience اور Temptation انسان کی شعوری خواہشات اور غیر شعوری محرکات کے درمیان ایک کشمکش کے دو مظاہر ہیں۔ مسیحی عقائد کے مطابق ضمیر کو (Voice of God within human soul) کہا گیا ہے۔ ایک حدیث شریف میں بیان کردہ ایک مثال میں بھی "واعظ اللہ فی قلب کل مومن" کہہ کر اسی باطنی قوت یعنی ضمیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کے اندر اخلاقی بصیرت کی ایک جبلی استعداد بھی رکھی گئی ہے۔ عملی انحراف و فساد کے باوجود اور گمراہی کی استثنائی کیفیات کے سوا انسان کے اندر نیکی یا فضیلت کے بارے میں ایک اعتراف یا محبت اور برائی یا رذیلت کے بارے میں نفرت پائی جاتی ہے۔ دوسروں کو برا کام کرتے دیکھ کر اسے دُکھ ہوتا ہے اور وہ خود بھی اپنے ذاتی اخلاقی عیوب کو ناپسند کرتا ہے۔ اور اگر کسی ایسی چیز کا مرتکب ہوتا ہے تو یا تو سے چھپاتا ہے یا اس پر اسے سخت ندامت ہوتی ہے۔ یا پھر عقل کی مدد سے اس کے لیے جواز تلاش کرتا ہے۔ (بل الانسان علی نفسه بصیرة ولو القی معاذیره) کوئی آدمی اپنے آپ کو جھوٹا، خائن اور دغا باز کہلانا آخر کیوں پسند نہیں کرتا۔

قرآن کریم بالعموم اپنے اخلاقی نظام کی بنیاد خیر و شر اور عدل و ظلم کے درمیان تمیز کر سکنے والے اسی عام انسانی شعور پر رکھتا ہے۔ اور عملی ہدایات دیتے وقت ان (قدروں) کے فہم کے بارے میں انسان کی اسی باطنی حس پر اعتماد کرتا ہے۔ معروف، منکر، عدل، احسان، فحشاء، امانت اور خیانت وغیرہ کی شرعی وضاحت کے ساتھ ساتھ قرآن کریم میں چالیس سے زیادہ مقامات پر خیر و شر کی

تمیز کے بارے میں انسان کے اس اخلاقی ضمیر اور اسی اندرونی حس پر زور دیا گیا ہے۔ اور یہی وہ حس یا ضمیر ہے جو انسان کے قلب و دماغ اور اعضا و جوارح کے اعمال میں ہم آہنگی نہ پائے جانے پر ٹھیک اسی طرح مضطرب ہوتا ہے جس طرح انسانی اعصاب کسی جسمانی اذیت سے متاثر ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں اس انسانی استعداد کا ذکر مختلف ناموں سے کیا گیا ہے۔ غالباً سب سے نمایاں بیان اس کا "نفس لوامہ" کے نام سے کیا گیا ہے۔ سورۃ القیامۃ میں اسی نفس لوامہ یا انسان کے اخلاقی ضمیر کو زندگی بعد از موت کی شہادت اور دلیل صداقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مفسرین نے قیامت اور نفس لوامہ میں مناسبت اور باہمی تعلق پر بعض عمدہ نکات اور نفس لوامہ سے معنی مراد کے بارے میں جو مختلف اقوال بیان کیے ہیں۔ ان میں اکثر نے اسے ضمیر انسانی کے ہم معنی بھی قرار دیا ہے۔

مثلاً رازی نے ایک معنی "النفس الشریفة التی لا تزال تلوم نفسها" کیا ہے۔ طبرسی نے ایک مفہوم — "النفس المؤمنة التی تلوم نفسها فی الدنیا و تحاسبها" بیان کیا ہے۔ روح المعانی میں ایک قول یوں بھی بیان ہوا ہے "هی التی تنورت بنور القلب فکلما صدر عنها سیئة بحکم جبلتها الظلمانیة اخذت تلوم نفسها و نفرت عنها۔

لوامہ (بار بار ندامت دلانے والا) سے صیغہ مبالغہ میں جو ایک اعادہ و تکرار کا مفہوم ہے وہ بھی اس دنیا میں ضمیر کا عمل مراد لیے جانے کی ایک مزید دلیل ہے۔

بعض مفسرین نے "ان کل نفس لما علیها حافظ" کی تفسیر میں اس "حافظ" کے معانی میں انسان کی اس باطنی استعداد اور تمیز نیک و بد کی طرف بھی

Marfat.com

اشارہ کیا ہے۔ (روح المعانی)

ایک مؤلف نے ابن درید کی کتاب الاشتقاق کے حوالے سے ''مسلم'' کے معنی میں یہ بات لکھی ہے کہ "اشتقاق المسلم من قولهم اسلمت لله ای سلم له ضمیری ای خلص" ہے۔.....ابن درید کی اس تعریف میں اسلام اور ضمیر کے تعلق کے اس ذکر سے یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ خود ضمیر حق و باطل کا معیار ہرگز نہیں۔ تاہم اسے حق و باطل کا جو معیار دے دیا جائے۔ تو پھر وہ انسان کے ظاہر و باطن میں اس معیار کے تضاد پر مضطرب اور بے چین ہو جاتا ہے۔ اور انسان کو ایسے رویہ پر ٹوکتا ہے۔

یہ نفس لوامہ یا ضمیر حافظ یا اخلاقی بصیرت ایک زبردست قوت ہے مگر اس کی مثال کمپیوٹر کی سی ہے جو مطلوبہ جواب فوراً دیتا ہے مگر Feeded data کے مطابق نیکی و بدی کا جو تصور ضمیر کو Feed کر دیا جائے تو وہ اس کے مطابق بوقت ضرورت آناً فاناً نیکی یا بدی کے بارے میں سگنل دے گا۔

ضمیر کے اندر نیکی بدی کا یہ تصور یا مواد (Data) مختلف ذرائع سے بہم پہنچایا جاتا ہے۔ جس کا سب سے اعلیٰ اور درست ذریعہ تعلیماتِ رسالت ہیں.....حواس ظاہری کی طرح انسان کی یہ باطنی قوت (ضمیر) بھی اپنی قوت و فعالیت میں یکساں نہیں رہتی کہ انسان کے کردار کو ہمیشہ اپنا پابند بنا سکے۔ اس لئے اس کے ساتھ ہی اس استعداد کی تقویت یا تربیت کے لیے ایک دوسری انسانی قوت یعنی عقل و دانش اور خصوصاً اجتماعی عقلِ انسانی.....بلکہ ہر دور کے اہل صلاح و صالحین کی تائید حاصل کرنے والے اصول و احکام سے مدد لینا بھی ضروری ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کتب سماویہ اور سابقہ انبیاء کرام کی

تعلیمات کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ اس طرح قرآن اور اسلام کے حوالے سے بات کرتے ہوئے اس وقت ہمارا اصل موضوع مطلقاً "ضمیر" نہیں بلکہ قرآن و سنت کی روشنی میں پروردہ و تربیت یافتہ ضمیر ہے جسے ہم دینی ضمیر کہہ سکتے ہیں۔ تمام انبیاء کی بعثت کا مقصد اسی دینی ضمیر کی تربیت یا ضمیر کی دینی تربیت تھا کیونکہ تزکیہ نفوس کی اصل اور مضبوط اساس یہی ہے۔

قرآن کریم کی رو سے نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی دینی ضمیر کی تربیت ضروری ہے۔ جس طرح انسانی حواس بیماری، ضعف یا فقدان کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح انسان کی یہ اندرونی قیمتی استعداد ضمیر بھی اس قسم کی آفات کی زد میں آ سکتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے اس باطنی حس کو زندہ، استوار اور فعال و بیدار رکھنے پر نہ صرف زور دیا ہے بلکہ اس کیلئے عملی تدابیر بھی بیان کی ہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان کے اندر محض خارجی ذرائع سے کوئی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی جب تک خود اس کے اندر تبدیلی نہ پیدا ہو یہ بات افراد و اقوام سب پر صادق آتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے انسان کی ان باطنی قوتوں یعنی لب و عقل اور قلب و ضمیر کو مخاطب کیا ہے اور اپنی ان فطری استعدادات سے مطلقاً کام نہ لینے والوں کو "کالانعام بل ھم اضل" کہا ہے۔

ضمیر کو حق شناس بنانے، اسے بیدار رکھنے اور اس کی تقویت اور تربیت کے لئے قرآن کریم نے حسب ذیل اقدامات و تدابیر کا ذکر کیا ہے۔

☆ سب سے پہلی چیز ایمان باللہ ہے۔ کسی فلسفی کا قول ہے کہ عقیدہ دینیہ (ایمان) کے بغیر ضمیر کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی عدالت بغیر جج کے ہو۔

ایمان باللہ کے بغیر قلب ایک بنجر زمین ہے لیکن جب ایمان اعماق قلب تک پہنچتا

ہے۔ تو ضمیر کا پودا اس میں برگ و بار لانا شروع کر دیتا ہے۔ اور بقول باہوؒ قلب مومن کے پودے کی خوشبو انسان کے باطن سے نکل کر اس کے ظاہر یعنی اس کے اعمال میں سرایت کرنا چاہتی ہے۔ یہ اس کا فطری تقاضا ہے۔

☆ ذکر اللہ یعنی اللہ تعالی اور اس کے احکام کی بار بار یاد، اس کا اعادہ اور تکرار دینی ضمیر کی تربیت کے لئے دوسرا اہم اقدام ہے اسلامی عبادات اسی لئے دینی ضمیر بلکہ اجتماعی دینی ضمیر کو زندہ و بیدار رکھنے کا ایک نہایت موثر ذریعہ ہیں۔ اور شاید اسی لئے تمام اسلامی عبادات کو ایک اجتماعی رنگ دیا گیا ہے۔

انفرادی سطح پر بھی عبادات انسان کے لیے اخلاقی و دینی ضمیر کی بیداری کا باعث بنتی ہیں۔ کیونکہ ہر عبادت سرا و علانیۃ یکسانیت ہی سے ضمیر مطمئن ہو سکتا ہے۔ حواس کی لذتوں کی طرح ضمیر یا باطن کی لذت کا سامان اس یک رنگی میں پوشیدہ ہے۔

☆ توبہ اور رجوع الی اللہ ضمیر انسانی کو زندہ اور بیدار رکھنے کیلئے ایک نہایت موثر ذریعہ بھی ہے اور بیداری ضمیر کی علامت بھی ہے۔ جب ضمیر کی آواز کسی ''جہالت'' کے باعث نظر انداز کر کے انسان کوئی برا کام کر بیٹھتا ہے تو قرآن کریم کے حکم کے مطابق ایسے آدمی نے گویا اپنے ضمیر کو سخت خطرے میں ڈالدیا ہے۔ اسے فوراً اپنے ضمیر کو موت سے بچانا چاہیے۔ جس طرح کسی گرے ہوئے مکان کے ملبہ کے اندر سے فوری کارروائی کے ذریعے کسی کی جان بچائی جاسکنے کے امکانات ہوتے ہیں اسی طرح گناہ کے اس ملبے سے ضمیر کو نجات دلانے کے لئے ''یتوبون من قریب'' پر عمل کرنا ضروری ہے۔

Marfat.com

توبہ اور اصلاح استغفار کے سلسلے میں قرآن کریم کے تمام احکام کا مقصد انسان کی اس باطنی استعداد کو فنا سے بچانا اور اسے برقرار رکھنا ہے۔

قرآن کریم میں توابین کا صیغہ مبالغہ ایک سے زیادہ جگہ آیا ہے جس میں تکرار کا مفہوم موجود ہے۔ قرآن کریم میں ہی دوسری جگہ صفات مومنین میں "ولم یصروا علی مافعلوا" کا ذکر بھی آیا ہے۔ ایک حدیث شریف میں "لم یصرّ من استغفروان عاد فی الیوم سبعین مرۃ"...... توبہ و استغفار کا یہ عمل پیہم انسان کو اس عدم اصرار کی منزل تک پہنچانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

ضمیر بیدار کی اصل اہمیت گناہ سے بچانے میں نہیں بلکہ گناہ پر پچھتانے اور ندامت آشنا کرانے میں ہے۔ اصل توبہ ندامت ہی کا نام ہے۔ "انما التوبۃ الندم"...... اور ضمیر کی یہ ندامت کوئی معمولی شے نہیں یہ تو اجرائے حد سے بھی سخت تر شے ہے۔

دینی ضمیر اور خصوصاً اجتماعی دینی ضمیر کو زندہ و بیدار رکھنے کے لئے ہی قرآن کریم نے ایک نظام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر زور دیا ہے۔ امر بالمعروف تواصی بالحق والصبر اگر ضمیر دینی کے لیے باعث نشوونما و قوت ہیں تو نہی عن المنکر دینی ضمیر خصوصاً اجتماعی دینی ضمیر کو موت و ہلاکت سے بچانے کے لئے ناگزیر ہے۔ قوموں اور ملتوں کی حیات اجتماعیہ میں منکرات وبا کی طرح پھیلتے ہیں۔ اور اگر فوری تدارک اور مسلسل نگرانی نہ کی جائے تو اجتماعی ضمیر کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ بنی اسرائیل کا واقعہ قرآن و حدیث میں اس کی واضح مثال کے طور پر بیان ہوا ہے۔ "کانوا لایتناھون عن منکر فعلوہ" کے باعث ہی وہ سخت سزا کے مستحق ٹھہرے تھے۔ اسلامی حکومت کے پروگرام اور بنیادی فرائض میں آخری نہی عن المنکر ہے (الذین ان مکناھم [illegible]

سورۃ الحج: ٤١)

پہلے تینوں امور (صلوۃ زکوۃ، امر بالمعروف) اگر ضمیر کی غذا ہیں تو وجود منکر ضمیر کے لیے سم قاتل ہے..... نہی عن المنکر سے غفلت پہلے تین امور کے مثبت اثرات پر پانی پھیر دینے والی بات ہے۔ کیا آپ کسی کو طاقت ور اور مفید غذائیں کھلانے کے ساتھ تھوڑا سا زہر کھلا دینے کو معمولی بات سمجھ سکتے ہیں؟ نماز روزہ زکوۃ کا اہتمام کرنے والے اگر صواحب یوسف کے ساتھ سمجھوتے بھی کرتے پھریں تو۔

''ناطقہ سربگریباں ہے اسے کیا کہئے!''

منکرات کو مٹانے کے اس امتحان میں عوام کے لیے تو چلئے اضعف الایمان کا گریڈ حاصل کرنے کا امکان موجود ہے..... مگر ''لمبے ہاتھوں والے''۔ اور ''لمبی زبانوں والے'' اصحابِ ابلاغ کے ایمان وضمیر کے متعلق کیا رائے قائم کی جاسکتی ہے؟

ضمیر بیدار کی رعایت کے حق میں قرآن کریم کا یہ حکم بھی قابل ذکر ہے کہ بیدار اور زندہ ضمیر والوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔ مردہ ضمیر والے بڑے صاحبوں پر اپنی توجہات مرکوز کرنے کی بجائے باضمیر عوام کو تلاش کیجئے۔ "عبس و تولی" کے واقعہ نزول میں کیا اس حقیقت کی طرف اشارہ نہیں ہے۔

جب ایمان، ذکر اللہ، تقویٰ اور خشیۃ اللہ کے ذریعے ضمیر کی تربیت و تقویت کی جائے تو وہ اس درجہ بیدار اور اتنا حساس ہو جاتا ہے کہ اس مرحلہ پر ضمیر کا فتوی فقہاء کے فتوؤں پر قابل ترجیح ہو جاتا ہے۔ تقوی کے ذریعے درجہ فرقان تک پہنچ جانے پر ہی "استفت قلبك" کا اطلاق ہوتا ہے۔

البر ما اطمانت الیه النفس و اطمان الیه القلب والاثم ما حاك فی النفس و ترددفی الصدر

Marfat.com

اسی درجے کے لیے کہا گیا ہے۔

دینی ضمیر کی نیند یا موت کی سب سے زیادہ خطرناک صورت علماء اور رجال دین کے ضمیروں کا سوجانا یا مرجانا ہے قرآن کریم میں یہود کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "لو لا ینهاهم الربانیون والاحبار عن قولهم الاثم و اکلهم السحت لبئس ما کانوا یصنعون" ایسے بے ضمیر علماء سے ہدایت حاصل کرنے کی بجائے آدمی کے لیے اپنے دینی ضمیر سے کام لینا شاید زیادہ بہتر ہے۔ معری نے اسی لیے کہا تھا۔

والعصا للضریر خیر من القا
ئد فیه الفجور والعصیان

قرآن کریم نے اپنے بعض احکام میں صورت امتثال یا کیفیت تعمیل کا فیصلہ خود ضمیر بیدار پر چھوڑ دیا ہے۔ اس کی ایک بڑی مثال "قل العفو" میں اس "العفو" کا تعین ہے۔ ضرورت سے زائد کے اس تعین میں ہی آدمی کے ایمان و ضمیر کا سب سے بڑا امتحان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور خصوصاً حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے اس کی جو عملی مثال قائم کی وہ تاریخ عالم میں اپنی نظیر آپ ہے کہ حکمران ہوتے ہوئے خوراک، لباس اور مکان کے لحاظ سے اپنا معیار زندگی اس سے اونچا نہیں ہونے دیا جو وہ اپنی رعیت کے افراد کو کم از کم مہیا کر سکتے تھے۔

قرآن کریم کی آیت "اقرء کتابك کفی بنفسك الیوم علیك حسیبا" سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میزان ضمیر ہی میزان آخرت ہوگی۔ ضمیر بیدار کو اسی دنیا میں محاسب اعمال بنانا ہی حساب آخرت کی سب سے بڑی اور عمدہ تیاری ہے۔

Marfat.com

قرآن کریم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ 'نھی النفس عن الھوی' اگر ضمیر کی بیداری کا ثبوت ہے۔ اور ایثار الحیوۃ الدنیا اگر ضمیر کی قطعی موت کا ثبوت نہ بھی ہو تو بھی خیریت کی علامت ضرور نہیں ہے۔

اور ضمیر کی موت ہی دلوں پر لگنے والی وہ خدائی مہر ہے جس کے بعد انسان کے اندر سے کسی تبدیلی کے امکانات بالکل ختم ہو جاتے ہیں۔

اعاذنااللّٰہ من ھذا

Marfat.com

عظمت قرآن — ایک اور پہلو

الحمد للّٰہ وحدہ والصلوۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ
اما بعد! فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم
قل فاتوا بکتب من عند اللّٰہ ھو اھدی منھما اتبعہ ان
کنتم صدقین فان لم یستجیبوا لک فاعلم انما یتبعون
اھوآءھم۔ ومن اضل ممن اتبع ھواہ بغیر ھدی من اللّٰہ
ان اللّٰہ لا یھدی القوم الظالمین (القصص : ۴۹۔۵۰)

آج کرۂ ارض پر بسنے والے انسانوں کی غالب اکثریت اگرچہ اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ اس کارخانہ حیات کا ایک بنانے والا ہے جو خود ہی اس کا چلانے والا ہے۔ (کسی کو ٹھیکہ پر نہیں دے رکھا) — اور یہ کہ اس خالق و مالک نے کائنات کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ شے بھی بے کار اور بے مقصد نہیں بنائی — انسان نے کائنات کی بے شمار چیزوں کے مقصد تخلیق پر توجہ دے کر اپنے علوم کو تو کہیں سے کہیں پہنچا دیا، لیکن عجیب بات ہے کہ خود اپنے مقصد تخلیق کے بارے میں وہ تغافل اور تجاہل پر ہی گذارہ کرتا رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان نے زندہ رہنے کیلئے اس کائنات کی ضرورت ہے، لیکن خود کائنات کی زندگی کیلئے انسان کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس لیے عقل انسانی کو اس بات پر آمادہ کرنا بڑا مشکل کام ہے کہ وہ یہ مان لے کہ انسان کی زندگی اور اس کی حیرت انگیز صلاحیتیں بالکل بے مقصد

Marfat.com

یہ مقالہ انجمن خدام القرآن کی تیسری سرلانہ قرآن کانفرنس میں پیش کیا گیا۔

ہیں--- وہ زندگی اور وہ صلاحیتیں جن کی بقاء اور نشوونما پوری کائنات کا مقصد تخلیق معلوم ہوتا ہے۔

عقل و دانش اور ارادہ و اختیار سے بہرہ ور ہونے کی بنا پر، اور شعوری یا غیر شعوری طور پر مختلف عوامل کے زیر اثر، ہر انسان اپنی زندگی کا ایک مقصد متعین کر لیتا ہے۔ مقصد کا یہی تعین اس کے جملہ اعمال کی صورت گری کا باعث بنتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر متضاد مقاصد کے باہمی تصادم اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی انسانی ناکامیوں، مایوسیوں، تباہیوں اور خوں ریزیوں کے مسلسل تاریخی عمل نے ثابت کر دیا ہے کہ انسانیت کی فلاح و بہبود بلکہ بقاء کے لیے ضروری ہے کہ مشترک انسانی اقدار کی بنا پر پوری انسانی زندگی کا کوئی عالمگیر مقصد اور نصب العین متعین ہونا چاہیے۔ اختلاف ''کیوں'' میں نہیں صرف ''کیا؟'' میں ہے۔

مجمع بازوں کے بے پناہ شور وغل اور خریداروں کی تمیز سودوزیاں کوشل کردینے کی ساری فسوں سازیوں کے باوجود بازارِ حیات میں انسانوں کی اکثریت ابھی اس حقیقت سے آگاہ ہے۔ بلکہ شاید آگاہ تر ہورہی ہے۔ کہ سعدیؒ کے الفاظ میں ''خوردن'' اور عوامی زبان میں ''روٹی، کپڑا اورمکان'' انسان کی حیوانی زندگی کی بقاء کے لیے ایک بنیادی ضرورت تو ہے مگر اسے اور صرف اسے ہی انسانی زندگی کی منزل مقصود یا اس کا بدل اور انسان کی ساری صلاحیتوں کا ماحصل ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

حیوانات اپنی زندگی کی بقاء اور اس میں توازن کے لیے (جس میں افزائش نسل بھی شامل ہے) بیرونی دنیا میں بعض طبعی قوانین اور اندرونی طور پر بعض حواس اور جبلتوں کے تابع سرگرم عمل رہتے ہیں۔ یہ حواس اور جبلتیں

حیوانات کی زندگی کا مقصد ''خوردن'' تک محدود بھی کر دیتی ہیں اور اس مقصد کے حصول کا واحد ذریعہ بھی بنتی ہیں۔

انسان کا معاملہ ذرا مختلف ہے، اسے حواس اور جبلتوں کے علاوہ عقل بھی دی گئی ہے۔ عقل ایک ایسی صلاحیت ہے جس کے ذریعے انسان بڑی حد تک اپنی حیوانی جبلتوں پر قابو پالیتا ہے اور اپنی ادنیٰ فطرت کو اُبھرنے یا بے لگام ہونے سے روک بھی سکتا ہے۔ دوسری طرف یہی ''عقل'' انسان کی حسی ضروریات اور اس کی جبلی خواہشات کی تسکین کے لیے ذرائع و اسباب کی تلاش کو --- کبھی مکرو تدبیر کے ذریعے اور کبھی قوائے فطرت کی تسخیر کے ذریعے --- سہل اور آسان کر دیتی ہے۔ یوں ''عقل'' انسان کے لیے حیوانات کے مقابلے پر مسئلے ''خوردن'' کا بہتر اور تیز تر حل مہیا کرتی ہے تاکہ وہ مقصد زیستن کی طرف متوجہ ہو سکے --- مگر غالباً اس وجہ سے کہ عقل کا دائرہ کار بہر حال حسی اور جبلی زندگی تک محدود ہے، عقل انسانی اکثر حواس اور جبلتوں پر حکمرانی کرنے کے بجائے ان کے غلام کی حیثیت سے کام کرنے لگتی ہے۔ عقل کی حیثیت ایک سواری کی سی ہے جس کو کسی بھی منزل تک بآسانی پہنچنے کے لیے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ رہا خود منزل و نصب العین کا تعین، تو یہ تنہا عقل کے بس کی چیز نہیں ہے۔ اس کے لیے خود اُسے کسی اور سرچشمہ علم کی ضرورت ہے۔

جس ذات برتر نے انسان کے اندر مختلف صلاحیتیں ودیعت کیں، جس نے انسان کی حواس اور جبلتوں کی اصلاح اور امداد کے لیے عقل عطا کی، اس نے عقل کی امداد اور اصلاح کے لیے، انبیاء کرام علیہم السلام کے پاک نفوس کے ذریعے خارجی ہدایت وحی سے بھی نوازا۔ یہ خارجی ہدایت انسانی عقل و بصیرت کے لیے وہی درجہ رکھتی ہے جو بصارت کے لیے خارجی روشنی۔

Marfat.com

اس ہدایت یعنی انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے مسلح ہونے کے بعد انسان جبلتوں، حواس اور عقل کے حلقہ در حلقہ جال سے باہر نکل آنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ان آسمانی صداقتوں کی روشنی میں انسان اپنی تقدیر کا تصور اور اپنی منزل کا تعین کر سکتا ہے۔--- وحی الٰہی یا پیغمبرانہ شعور انسان کو ان حدود سے آگاہ کرتا ہے، جن کے اندر رہنا انسان کی سلامتی و بقاء اور اس کی ذات میں مضمر صلاحیتوں کی صحیح نشوونما کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس ہدایت کے قبول کر لینے ہی کو اسلامی اصطلاح میں ایمان بالرسل اور ایمان بالکتب کہا جاتا ہے۔ رسول اور کتاب دونوں اسی ایک خدا کی طرف سے ایک ہی حکمت ربانی کے دو اجزاء اور ایک ہی مقصد دعوت کی تکمیل کے دو ذرائع ہوتے ہیں۔

انسانوں کی رشد و ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں انبیاء مبعوث فرمائے۔ ہر نبی کی تعلیمات اس ربانی علم و حکمت کا ایک جزء ہوتی تھیں جو اس کے سینے میں ہوتا تھا۔ اس تعلیم کا لفظی بیان بعض دفعہ کتاب یا صحیفہ کی صورت میں لوگوں کی رہنمائی کے لیے دیا جاتا تھا، جب کہ اس تعلیم کا عملی نمونہ اور مظہر خود رسول کی زندگی ہوتی تھی۔

قرآنِ کریم نسلِ انسانی کی رہنمائی کے لیے ربانی پیغامات اور وحی الٰہی کے، بذریعہ کتاب و رسول، نزول کے ایک طویل عمل کا مصدق بھی ہے اور مکمل بھی۔ ابتداء مختلف خطوں اور مختلف حالات میں بٹی ہوئی مختلف قوموں کو تاریخ کے خاص خاص ادوار میں خاص خاص ربانی پیغام پہنچانے ہی ضروری تھے۔ انسان کی ہمہ گیر ترقی کی رفتار اس قسم کی قسط وار تعلیم اور اس پر عمل کے وقفوں کے ذریعے ہی آگے بڑھائی جا سکتی تھی۔ اسلام کے ساتھ اس سلسلہ احکام ربانی یعنی دین کی تکمیل ہوگئی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری پیغمبر— اور قرآنِ کریم

۹۲۹۷۵

Marfat.com

انسانوں کے لیے اللہ کا آخری اور مکمل پیغام ہے۔ اور دونوں تمام مخلوق کے لیے عموماً اور انسانوں کے لیے خصوصاً اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر اتم ہیں "الرحمن علم القرآن" اور "وما ارسلنك الا رحمة للعالمین" کے ذریعے اسی حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے--- نوعِ انسانی کی طرف آخری نبی--- (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آخری کتاب آجانے کے بعد الہامی پیغاموں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اب اس آخری اور جامع و مکمل الہامی پیغام پر عمل کرکے--- یا اس کو رد کرکے اس کے نتائج دیکھنے کا زمانہ شروع ہوگیا۔

نزول قرآن کا دور انسانی تاریخ میں انسانی فرد کے زمانہ بلوغ سے مشابہت رکھتا ہے۔ قرآن کریم بالغ ''انسانوں'' نہیں--- بلکہ بالغ ''انسانیت'' یعنی عصر حاضر کو درپیش مسائل کے حل میں عقل انسانی کی رہنمائی کرتا ہے۔ اور اس مقصد کے لیے اپنے آپ کو ہدایت، علم، بصائر، شفاء، نور اور بینات وغیرہ کے اوصاف سے روشناس کراتا ہے۔ یعنی قرآن ہدایت دیتا ہے علم اور حکمت کے ساتھ--- بصیرت دیتا ہے دلیل و برہان کے ساتھ--- امراض قلبی کے لیے شفاء ہے بذریعہ موعظہ--- وہ نور ہے جو جہالت و نادانی کی تاریکیوں سے نکالتا ہے--- وہ ذکر للعالمین ہے جو ہر قسم کی فطرت کو اس کے کمالات یاد دلاتا ہے۔ وہ مومن و کافر، غنی و فقیر، متکبر و متواضع ہر ایک قسم کے انسان کی دل کی بات کی خبر دیتا ہے۔ ہر ایک فرد بشر اس کے کسی ایک عنوان کے تحت اپنا ذکر موجود پاتا ہے۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل کے تمام انسانی مسائل کا حل پیش کرنے میں قول فیصل ہے۔

آج کے انسان کو ایک پریشان کن مسائل نے گھیر رکھا ہے اور انہیں سے یہ آواز آتی ہے کہ فلاں نظام، فلاں فلسفہ، فلاں پارٹی یا شخص ہی اس کے تمام

مسائل یا کم از کم اہم مسائل حل کر سکتا ہے تو یہ گھبرایا ہوا انسان فوراً ادھر متوجہ ہوتا ہے فلاں نظام یا فلسفہ۔ ''تمام مسائل کا حل پیش کرتا ہے''— ہمارے زمانے کا سب سے بڑا جملہ مدحیہ بن گیا ہے۔

کیا عظمت قرآن کے متعلق ہمارے اس قسم کے تعریفی بیانات اور مدحیہ کلمات محض جذباتی قصیدہ خوانی تو نہیں ہے؟ قرآنِ کریم کے متعلق اس قسم کے بلند بانگ دعووں پر ہم کوئی دلیل بھی پیش کر سکتے ہیں یا نہیں؟ انسانی زندگی میں جذبات کی قدروقیمت اور افادیت و ضرورت، عقلی دلیل و برہان سے کسی طرح کم قرار نہیں دی جاسکتی۔ کتنی دفعہ ''خرد مندی'' کی انتہا ''صاحبِ جنون'' ہونے کی دعا پر منتج (۱) ہوتی ہے عوام اورعوامیت کے اس دور میں تو یوں بھی دلائل و براہین جذبات کے آستانہ عالیہ پر صف نعلین میں سرنگوں نظر آتے ہیں۔ تاہم غنیمت ہے کہ ہم ایک ایسے دور میں رہ رہے ہیں جہاں کم از کم کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بلند بانگ دعووں، مسحور کن وعدوں اور دلکش نعروں کی صداقت کے بارے میں حقیقت کے جویا اور اپنی اس جستجو میں دلائل کے طلبگار نظر آتے ہیں۔

حضرات! بڑے دعووں، وعدوں اور نعروں کے ذکر سے آپ کا ذہن ''گمراہ'' نہ ہونے پائے۔ بڑے دعوے اور بڑے وعدے ہمیشہ ہی فریب باطل یا سراب نظر نہیں ہوتے، کبھی کبھی وہ سراسر حق و صداقت پر مبنی بھی ہوتے ہیں اور انسان میں اس نازک فرق کا --- یعنی وعدہ رحمٰن اور وعدۂ شیطان میں--- امتیاز کرنے کی صلاحیت و دیعت کردی گئی ہے۔ کسی بھی پیغمبر کا دعوی نبوت و رسالت، غالباً انسان کے سامنے پیش کیے گئے دعووں میں سے سب سے بڑا اور بظاہر سب سے عجیب دعویٰ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس دعویٰ کے صدق یا کذب کو

پرکھنا ضروری بھی ہے اور مشکل بھی--- اسی لیے انبیاء کرام (علیہم السلام) کی صداقت کو اظہر من الشمس کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں مختلف قسم کے دلائل اور نشانات عطا فرمائے جن سے ان کے مخاطب کے اندر ودیعت شدہ تمام ذرائع ہدایت یعنی جبلت، حواس اور عقل میں سے کسی ایک کو بھی تصدیق کے بغیر چارہ نہ رہے۔ بلکہ جوں جوں آخری نبوت قریب آتی گئی، انسان کے لیے سب سے بڑے ذریعہ ہدایت یعنی وحی الٰہی کے ذریعہ انبیاء کرام (علیہم السلام) نے خود بھی اپنے ماننے والوں کو آنے والی نبوت کو قبول کرنے کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد پر آنحضور کی صداقت کی پرکھ اور پہچان کے لیے ہر وہ ممکن اور معلوم انسانی ذریعہ علم و ہدایت--- اندرونی یا بیرونی--- حسی یا وجدانی--- عقلی یا نقلی جمع کر دیا گیا، جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا قائل کرنے کے لیے دنیا کے کسی ایک بھی انسان کو درکار (۲) تھا۔ آقائے دو جہاں کی دعوی کی صداقت تمام دعووں کی صداقت کو قبول کرنا یا نہ کرنا ہی اسلام اور کفر کے درمیان حد فاصل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر دنیا کی ہر قوم، مذہب بلکہ ہر فرد کے سامنے (صرف مخصوص معزز اور مدعو حاضرین کے سامنے نہیں (۳)) ان کے مناسب حال دلائل پیش کرنا مسلمانوں کے لیے فرض کفایہ ہے۔

علم و عقل کی فراوانی کے اس دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر علمی و عقلی دلائل پیش کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ آنحضور کی صداقت پر ایک بہت بڑی زندہ علمی اور عقلی دلیل ''عظمت و اعجاز قرآن'' ہے۔ عظمت و اعجاز کا بیان بھی ایک واجب شرعی اور فرض کفایہ ہے۔ اس لیے کہ ''عظمت و اعجاز قرآن'' کے مختلف پہلوؤں کا بیان اور اس کی دلائل سے وضاحت

دراصل اثبات رسالت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی ہے۔(۴)

قرآن کریم نے خود اپنی عظمت و اعجاز کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی دلیل کے طور پر اس تحدی کی صورت میں پیش کیا ہے۔

(۱) وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورة من مثله وادعوا شهدآءکم من دون اللّٰه ان کنتم صدقین فان لم تفعلوا ـــــ ولن تفعلوا ـــــ فاتقوا النار التی وقودها الناس والحجارة اعدت للکافرین (البقرة، ۲۳، ۲٤)

(۲) وما کان هذا القران ان یفتری من دون الله ولکن تصدیق الذی بین یدیه وتفصیل الکتب لاریب فیه من رب العلمین ام یقولون افتربه قل فأتوا بسورة مثله وادعوا من استطعتم من دون اللّٰه ان کنتم صدقین بل کذبوا بمالم یحیطوا بعلمه ولما یاتهم تاویله کذلك کذب الذین من قبلهم فانظر کیف کان عاقبة الظلمین (یونس: ۳۷۔ ۳۹)

(۳) ام یقولون افتره قل فأتوا بعشر سور مثله مفتریت وادعوا من استطعتم من دون اللّٰه ان کنتم صدقین (هود: ۱۳)

(٤) قل لئن اجتمعت الانس والجن علی أن یأتوا بمثل هذا القرآن لایأتون بمثله ولو کان بعضهم لبعض ظهیرا (الاسراء: ۸۸)

Marfat.com

(٥) قل فأتوا بكتاب من عند الله هو أهدى منهما أتبعه
إن كنتم صدقين فإن لم يستجيبوا لك فاعلم أنما يتبعون
أهواء هم ومن أضل ممن اتبع هوله بغير هدى من الله
إن الله لا يهدى القوم الظلمين (القصص : ٤٩، ٥٠)

(٦) أم يقولون تقوله بل لا يؤمنون فليأتوا بحديث مثله
إن كانوا صدقين (الطور : ٣٣۔ ٣٤)

ان چھ آیات میں سے پانچ میں لفظ ''مثل'' استعمال ہوا ہے۔ ماحصل سب آیات کا یہ ہے کہ قرآن کریم بے مثل و بے نظیر کتاب ہے اور انسان اس کا جزوی مثل و نظیر پیش کرنے سے بھی ہمیشہ عاجز رہیں گے۔ قرآن کریم کا یہ چیلنج چودہ سو سال سے قائم ہے، دنیا اسے قبول نہیں کر سکی --- لیکن جس طرح مسیلمہ کذاب نے قرآن کے اسلوب کو نقل کرنے کی کوشش کر کے اپنے پیروکاروں کو دھوکہ دینے کی کوشش کی تھی --- اسی طرح آج مسلمان --- بے نام مسلمان --- کی نظر سے عظمت قرآن کو اوجھل رکھنے کے لیے بعض ''ازموں'' کو قرآنی نظام کے مماثل بلکہ اس سے بہتر نظام کی حیثیت سے متعارف کروا رہے ہیں۔ خود قرآن کریم کے ماننے والے --- کم از کم ماننے والوں کے ہاں پیدا ہونے والے --- بعض سیاست کار اور دانشور بھی اس مرض الحاد (۷) کے سرخ گھونگھٹ پر ہی مرے جا رہے ہیں۔ اس نظام کو قرآنی نظام کا مثل یا اس سے بہتر قرار دینے میں اس کوتاہ فہمی یا دانستہ مغالطے سے کام لیا جا رہا ہے، جس کی بناء پر ابراہیم علیہ السلام کے حاکم وقت نے موت و حیات پر قادر ہونے میں اپنے آپ کو رب ابراہیم کی ''مانند'' سمجھ لیا تھا۔ یا جس طرح کفار نے تعلی سے اپنی ساکھ رکھنے کے لیے ''لو نشاء لقلنا مثل هذا'' (الانفال : ٣١) کی صورت

میں ایک کھوکھلا سیاسی بیان ہی جاری کر ڈالا تھا۔

قرآن کریم پوری انسانی زندگی، اس کی ساری استعداد فکر و عمل کو ایک نظام کے تحت کر دیتا ہے۔ اب اگر کوئی دوسرا مذہب یا نظام بھی اسی قسم کے انداز میں انسانی فکر و عمل کے ہر دائرے میں اپنے نفوذ کے کچھ آداب و قوانین رکھتا ہے یا بنا ڈالتا ہے، تو اسے قرآن کریم کے مماثل نہیں بلکہ اس کے متوازی ایک الگ عمل ہی کہا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم کے متوازی مدعیان ہدایت ایک نہیں دس ہو سکتے ہیں، سوال تو "هل تستوی الظلمات والنور" (الرعد: ١٦) کا ہے۔ ہر مسلمان کو عصر حاضر کے اس شیطانی مغالطہ سے آگاہ ہونا ضروری ہے، جس کی رُو سے اسلام کو دیگر ادیان یا فلسفہ ہائے حیات کی ''مانند'' ایک دین یا فلسفہ حیات، قرآن کریم کو دوسری مذہبی کتابوں یا دساتیر عالم کی ''مانند'' ایک مذہبی کتاب یا دستور، اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دوسرے بانیان مذاہب یا مشاہیر کی ''مانند'' ایک بانی مذہب یا عظیم انسان (Hero) تسلیم کرنے پر اکتفا کر لینے کی تلقین کی جاتی ہے۔ قرآنی عظمت کو بظاہر اُجاگر کرنے اور بباطن مٹانے کی ایک صورت یہ بھی اختیار کی جا رہی ہے کہ قرآن کے دعوی ''بے مثلیت'' میں اسے مدعی کی بجائے مدعا علیہ قرار دیا جا رہا ہے۔ قرآن نے کہا تھا کہ اس ''جیسا'' اور اس کی ''مانند'' کوئی نہیں اب دانا دشمن اور نادان دوست استخاشہ کے منحرف گواہ بن کر یہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ قرآن عصر حاضر کے طاغوتی نظاموں کے عین ''مانند'' ہے اور وہ ان کے شانہ بشانہ چل سکتا ہے۔

ان حالات میں لازمی ہے کہ قرآن کریم کے فائق و برتر اور بے مثل و بے نظیر ہونے کو واضح کیا جائے۔ علمائے اسلام نے، جن میں سے بعض نے اعجاز القرآن کے موضوع پر مستقل تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، جہاتِ مماثلت اور وجوہ

Marfat.com

اعجاز سے بحث کرتے ہوئے لفظی و معنوی ہر دو جہات پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ان مباحث کو پڑھتے ہوئے بوصیریؒ کے مشہور نعتیہ قصیدہ (بردہ) کا ایک مصرع "فجوهر الحسن فيه غير منقسم" قرآن کریم پر صادق آتا دکھائی دیتا ہے۔ چند محدود صفات مل کر مجموعی طور پر اس کتاب کو بے مثل اور بے نظیر نہیں بناتیں، بلکہ خدا کی یہ کتاب اپنی ہر صفت اور ہر خوبی میں بے مثل اور بے نظیر کتاب ہے۔ جس طرح اس کا نازل کرنے والا لامحدود قدرتوں کا مالک ہے اسی طرح قرآن کریم کی صفات اور اس کے عجائبات بھی محدود نہیں۔ اشخاص و ادوار کے اختلاف کے لحاظ سے کسی کو ایک خوبی نمایاں نظر آئی تو کبھی دوسری اس سے بہتر معلوم ہوئی۔ مثلاً ابتداء میں قرآن کی عظمت و اعجاز کو اس کی فصاحت و بلاغت میں منحصر سمجھا جاتا رہا۔ یہ بات اپنی جگہ درست تھی۔ اور ہے--- مگر اعجاز قرآن کا یہ پہلو کم از کم اب اکثریت کے ادراک اور شعور سے ماوراء ہے۔

اگر اس نقطہ نظر سے غور کریں کہ قرآن نے پوری بشریت کو اپنی مثل لانے پر تحدی کی ہے، تو یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ قرآن تمام انسانی علوم و افکار کو چیلنج کرتا ہے تنہا فصاحت و بلاغت (شعری و نثری ادب) کو نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ فصاحت و بلاغت قرآن کا لباس ہے لیکن اصل تحدی (چیلنج) مضامین و علوم کے ساتھ ہے۔ قرآن کریم نے خود اپنے اوصاف میں فصیح و بلیغ کلام ہونے سے زیادہ اپنے ھدیٰ (ہدایت)، حکمت، علم، بصائر، شفاء، روح، موعظہ، برہان، ذکر، نور، بینات وغیرہ ہونے پر زیادہ زور دیا ہے۔

اگر اس تفصیل کو اجمال کی طرف لائیں تو ساری بات کا لب لباب اور محور بحث ایک لفظ "ہدایت" ہی نکلتا ہے۔ بلکہ آیات تحدی میں سے ایک میں تو واضح طور پر صرف مطلق مثل لانے کی بجائے ہدیٰ پر تحدی کا صاف ذکر کیا ہے

Marfat.com

ہے۔ فأتوا بکتاب من عند اللّٰہ ھو اھدی منھما --- یعنی قران کریم کتاب ہدایت ہونے کے لحاظ سے بے مثل و بے نظیر ہے۔ ہدایت سے مراد زندگی کے مقصد --- اور نصب العین کا تعین اور اس نصب العین کو پالینے کیلئے قطعی اور حتمی لائحہ عمل ہے۔ اور اس کو ہم آج کل کی زبان میں تمام انسانی مسائل کا حل کہتے ہیں۔ اس ہدایت یعنی تمام مسائل کے حل کو پالینے سے عقل انسانی کی عاجزی اور بے بسی کا اعتراف اب کوئی بے عقلی کی بات نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے کسی بھی "من دون اللّٰہ" کا انسانی مسائل کے حل کے لیے کسی درجے میں بھی مثل قرآن ہدایت لانے سے عاجز ہونا ناقابل فہم بات نہیں ہے۔ البتہ آیت کے الفاظ "فأتوا بکتاب من عند اللّٰہ ھو اھدی منھما" سے مادہ پرست دانشوروں کی بجائے ادیان عالم کے پیروکاروں کے سامنے قرآن کی دعوت پیش کرنے کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے اس لیے کہ آیت کریمہ کے الفاظ سے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ قرآن کی ہدایت سے کسی درجے میں مماثل ہدایت کے ملنے کا امکان اگر کہیں ہوسکتا ہے تو وہ کسی "من عند اللّٰہ" کتاب میں ہی ہوسکتا ہے کیونکہ قرآن کریم اور کتب سماویہ کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ ان میں ایک دوسرے کے معانی کی طرف رہبری کے علاوہ اسلوب اور فصاحت و بلاغت میں بھی مماثلت کے امکانات موجود ہیں۔ اور شاید اسی لیے قرآن کریم نے اس مقام پر تحدی میں "فأتوا بکتاب من عند اللّٰہ" میں مثلہ کی بجائے "ھو اھدی منھما" کی شرط لگائی ہے۔ اس طرح قرآن کریم کی ان ساری چھ آیات تحدی کا مجموعی مضمون کچھ یوں بنتا ہے--- "اے آسمانی ہدایت کے منکرو! اور عقل کا نام لے کر محض اپنی خواہشات نفس کے پرستار دانشورو! تم ہدایت تو کیا ہدایت کی مشابہت سے بھی دور ہی رہو گے--- اور اے آسمانی ہدایت ماننے اور اسے قبول کرنے کے

Marfat.com

لیے آمادہ انسانو! تمھیں یہ ہدایت قرآن کریم سے بہتر اور کہیں نہیں ملے گی"۔

عقلی رہنمائی کی بجائے عقل کی رہنمائی کے لیے آسمانی ہدایت کی ضرورت اب صرف تسلیم ہی نہیں کی جارہی بلکہ آج کا انسان اس کی تلاش میں ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی دیگر صحف سماویہ یا الہامی کتابوں پر فضیلت اور برتری کے پہلوؤں پر زور دیا جائے--- یہ وقت کی ضرورت ہے۔

قرآن کریم کی برتری صرف اس بات میں نہیں کہ وہ عقلی رہنمائی سے بہتر رہنمائی دیتا ہے۔ ہدایت کے معاملے میں اب عقل کو بھی ایک "مفلوج اور مغلوب دیو" سمجھا جانے لگا ہے۔(٦) قرآن کریم کی عظمت و اعجاز کا سب سے اہم نہیں تو بہت اہم پہلو یہی ہے کہ وہ عقل انسانی کی رہنمائی کرنے والی مذاہب عالم کی آسمانی کتابوں میں بھی سب سے بہتر ہدایت یا انسانی مسائل کے بہتر حل کا حامل ہے۔ اس کتاب مہیمن کو صحف سماویہ یا الہامی کتابوں پر کئی اور لحاظ سے بھی فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ ان میں سے کئی پہلو ایسے بھی ہیں جن کی وضاحت بذات خود مستقل تصنیف یا مقالہ کی محتاج ہے اور بعض پر تو کتابیں موجود ہیں۔ یہاں صرف ابتدائی خاکے کے طور پر صحف سماویہ پر قرآن کریم کی فضیلت و برتری کے چند اہم پہلوؤں کے عنوانات کا ذکر کیا جاتا ہے اور اہل علم سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ ان عنوانات کو اپنی تحقیق اور ریسرچ کا موضوع بنائیں۔

۱۔ اپنی پوزیشن (کتاب اللہ ہونے کے لحاظ سے) کی اندرونی شہادت اور وضاحت۔

۲۔ لانے والے کے ساتھ نسبت کی ظنیت یا قطعیت۔

Marfat.com

۳۔ لانے والے کی شخصیت اور کردار کے مطالعہ کا مواد۔

۴۔ آغازِ نزول سے آج تک پوری تاریخ کی حفاظت۔

۵۔ متن کی حفاظت کے انتظامات اور اُس کے نتائج۔

۶۔ تحریف و اتلاف اور حک و اضافہ سے حفاظت۔

۷۔ زبان نزول کا زندہ و تابندہ رہنا۔

۸۔ شستہ اور مہذب اسلوب (فحش اور حیا سوز عبارتوں سے پاک ہونا)

۹۔ جامعیت اور عالمگیریت کا دعویٰ۔

۱۰۔ دعویٰ تکمیل ہدایت (کسی آئندہ ہدایت کا محتاج نہ بنانا)

۱۱۔ علم صحیح اور فطرتِ صحیحہ سے متصادم نہ ہونا (ناقابل عمل احکام سے پاک ہونا)

۱۲۔ برپا کردہ انقلاب کی کیفیت۔

۱۳۔ بنیادی انسانی اقدار کے فروغ میں انسانی تہذیب وتمدن پر اثرات۔

Marfat.com

حواشی

۱۔ علامہ اقبال کا شعر ہے۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر!

۲۔ آنحضرتؐ کے پاس ایک آدمی نے آ کر کشتی لڑنے پر پچھاڑے جانے کو شرط صداقت قرار دے کر چیلنج کیا۔ حضور نے اسے ایک دفعہ نہیں بلکہ تین دفعہ پچھاڑ دیا۔ وہ مسلمان ہو گیا۔ اسی طرح ایک اور آدمی نے آپؐ سے کہا ''مجھے کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں تم خدا کی قسم کھا کر کہہ دو کہ تم واقعی اللہ کے رسول ہو۔'' حضورؐ نے قسم کھا کر کہا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ وہ آدمی فوراً ایمان لے آیا۔

۳۔ انھی دنوں عالمی سیرت کانگرس کا خاص شو ختم ہوا تھا۔

۴۔ قرآن کانفرنس کی جس نشست میں یہ مضمون پڑھا گیا اس کا موضوع بحث ''عظمت و اعجاز قرآن'' تھا۔

۵۔ الف لیلہ کا پیش رو ایک عربی قصہ ہے حال ہی میں صلاح الدین المنجد نے ایک قلمی نسخے سے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ اس میں ''عروس العرائس'' نامی ایک نوجوان حسین و جمیل عورت کی داستان ہے جو اپنے حسن کی طرح اخلاقی بے راہ روی اور تمام کی نحوست میں بھی بے مثل ہے۔ جو بھی اسے دیکھتا ہے فدا ہو جاتا ہے۔ وہ جہاں بھی قدم رکھتی ہے، بربادی لاتی ہے۔

۶۔ ان ہی دنوں اخبارات میں شاہ ایران کا امریکہ سے متعلق اسی قسم کا مشہور بیان آیا تھا۔

خدمت قرآن کے میدان☆

قرآن کریم پر کلام اللہ اور کتاب اللہ کی حیثیت سے ایمان لانا ایک مسلمان کے لیے اجزائے ایمان کا ایک جزء بھی ہے اور کامل و مکمل ایمان کے مضمرات اور مقتضیات کی تمام تفصیلات کی اساس اور بنیاد بھی ہے ۔قرآن بیک وقت منبع ایمان اور سر چشمہ یقین بھی ہے اور سالک راہ خدا یا مجاہد فی سبیل اللہ کے لیے راہ و رسم منزل سے آگاہی اور سخت مقامات کی نشان دہی پر مشتمل ایک مکمل مجموعہ ہدایت بھی ہے ۔ قرآن معاش و معاد یعنی دنیا و آخرت کی فلاح و کامرانی کے لیے راہنما ہے اور اس نصب العین کے حصول میں پیش آنے والی ہر مشکل کا حل اور ہر مرض کی دواء اور شفاء ہے گویا وہ کونسا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا۔

مگر اس وقت ہمارا موضوع قرآن کی اہمیت یا عظمت کا بیان نہیں ہے یہ چند فقرے بھی تمہید کے طور پر زبان (قلم) پر آ گئے ۔

دین اسلام میں قرآن کا یہ مقام ہی اس کے ماننے والوں پر کچھ فرائض اور واجبات عائد کرتا ہے ۔اسی کو آپ ''مسلمانوں پر قرآن کے حقوق'' بھی کہہ سکتے ہیں ۔ان حقوق اور فرائض کو مختصراہم پانچ یا چھ بنیادی عنوانات میں تقسیم کر کے ''حقوق پنجگانہ'' یا شش جہات واجبات کی صورت میں بھی بیان کر سکتے ہیں۔ مگر ان حقوق کی ادائیگی اور ان فرائض کی بجا آوری سے خدمت قرآن کے

☆ یہ مقالہ انجمن کے زیر اہتمام سالانہ محاضرات قرآنی منعقدہ مارچ ۸۷ء میں پڑھا گیا۔

اتنے میدان سامنے آتے ہیں کہ ان تمام میدانوں میں قرآن کے لیے کام کرنا اور اس میں خدمت کا حق ادا کرنا کسی ایک فرد کے لیے ممکن ہی نہیں۔اسی لیے یہ مجموعی طور پر پوری امت کی ذمہ داری ہے اور تقسیم کار کے طور پر اپنی اپنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق قرآن کریم کی کوئی نہ کوئی خدمت سر انجام دینا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ کے صحابہ کرامؓ اور ان کے تابعین اور بعد میں آنے والے سلف صالحین نے مختلف میدانوں میں قرآن کی جو خدمات سر انجام دیں اس نے آنے والوں کے لیے نہ صرف عمل کی راہیں متعین کر دیں بلکہ خدمت قرآن کے بہترین عملی نمونے بھی چھوڑے ہیں۔

ڈاکٹر لبیب السعید نے اپنی کتاب ''الجمع الصوتی الاول للقرآن الکریم'' میں امت مسلمہ کی قرآنی خدمات پر تبصرہ کا آغاز۔علامہ عبداللہ یوسف علی کے انگریزی ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں سے چند سطروں کے ترجمہ سے کیا ہے۔

لیس فی الدنیا کتاب وضعت فی خدمته مثل هذه
الکثرة من المواهب التی وضعت فی خدمة القران ولا
مثل هذه الوفرة من العمل و الوقت و المال''

علامہ عبداللہ یوسف علی مرحوم کی اصل عبارت یوں ہے۔

''There is no Book in the world in whose service so much talent, so much labour, so much time and money have been expended as has been the case with the Quran.''

قرآن سے متعلق فرائض ادا کرنے یا قرآن کے لیے خدمات سر انجام

Marfat.com

دینے کے کام کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ حفاظت قرآن ۲۔ نفاذ قرآن

حفاظت قرآن میں اس کے متن کے حفاظت اس کے معنی کی حفاظت اور اس کی حقانیت کی حفاظت شامل ہیں اور حفاظت قرآن کی غایت احکام قرآنی کا عملی نفاذ ہے۔ حفاظت قرآن سے متعلق تمام خدمات و انتظامات آیہ کریمہ لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید کی عملی تفسیر اور ظہور حق کا ایک نمونہ ہیں تو نفاذ تشریع قرآنی کی ہر مخلصانہ کوشش بفحوائے آیت کریمہ "جاء الحق وزھق الباطل غلبہ حق کی منزل مراد کی طرف ایک قدم ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اگر کسی زمانے میں یا کسی جگہ کے مسلمانوں نے خدمت قرآن کے کسی ایک میدان میں کوتاہی اور تساہل سے کام لیا تو اس کی تلافی کے لیے کسی دوسرے زمانے یا کسی دوسرے علاقے میں اللہ تعالی افراد و جماعات کی صورت میں خدام قرآن پیدا کرتا رہا ہے۔

حضرات! یہاں تک پہنچنے کے بعد اور ''منزل مراد'' اور ''ادائے واجب میں کوتاہی'' کے ذکر سے مجھے پاکستان اور قرآن میں ایک عجیب مماثلت نظر آئی مثلاً۔

۱۔ دونوں کی خدمت خلوص سے زیادہ چرب زبانی کے ساتھ کی جا رہی ہے۔

۲۔ دونوں کے واسطے کام کرنے والوں کے مقابلے پر دونوں سے اپنا کام لینے والے زیادہ ہیں۔

۳۔ پاکستان کے مقاصد اور قرآن کے مطالب کا خلاصہ لا الہ الا اللہ ہی تھا اور ہے لیکن دونوں کے نام لیواؤں میں اللہ اور غیر اللہ کے فرق کو بھی نہ سمجھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔

۴۔ پاکستان اور قرآن کے مقاصد کے مطابق چلنے کی بجائے دونوں کو اپنے مقاصد کے مطابق ''چلانے'' والے بھی سرگرم عمل ہیں۔

۵۔ اس وقت دونوں ہی اندرونی خرکاروں اور بیرونی تخریب کاروں کے نرغے میں ہیں۔ اور یوں دونوں کی خدمت میں ایک طرح کا عدم استحکام پیدا ہوگیا ہے۔

یہ سوچ کر اور پھر یہ دیکھ کر کہ ان محاضرات کے عنوانات میں استحکام کا لفظ غالب ہے تو اب مجھے اپنے عنوان ''خدمت قرآن کے میدان'' کو ''استحکام خدمات قرآن'' میں بدل لینا مناسب معلوم ہوا۔

نیز اس وجہ سے بھی کہ خدمت قرآن کے میدان اب میں کیا متعین کروں گا۔ وہ تو عہد رسالت اور دور تبع تابعین کے درمیان ہی متعین ہو چکے تھے۔ بعد والے تو اس میں اپنی ''خدمت'' کے لئے ''ختم شریف'' کا اضافہ ہی کر سکے۔

لہذا اب ہم خدمت قرآن کے صرف ان پہلوؤں پر نظر ڈالیں گے جہاں ہمارے بزرگوں نے تن دہی سے کام کیا مگر ہم نے اپنی غفلت سے عدم استحکام کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اس طرح خدمت قرآن کے بنیادی میدان بنتے ہیں۔ اسے لکھنا لکھانا۔ اسے پڑھنا پڑھانا۔ اسے سمجھنا سمجھانا۔ اس کو دشمنوں کے حملوں سے بچانا اور معاشرے میں اسی کے قانون کا سکہ جمانا۔

قرآن کے لیے کوئی خدمت سرانجام دینے کا سب سے پہلا موقع یا اعزاز جو بعض صحابہؓ کو حاصل ہوا وہ کتابت وحی کا تھا۔ عہد رسالت میں کتابت آیات کی یہ خدمت ہی عہد صدیقی میں جمع قرآن بصورت مصحف ظاہر ہوئی اور اسی مصحف کی نقول سے عثمانی ایڈیشن کے مصاحف تیار کئے گئے۔ اس طرح

Marfat.com

مصاحف عثمانیہ کے ذریعے عہد نبویؐ کا طریق کتابت بھی محفوظ ہوگیا۔ .....اور اسی لیے آئندہ کے لیے کتابت مصحف کا معیار صحت یہی قرار پایا کہ وہ ان مصاحف میں سے کسی ایک کی ہو بہو نقل ہو۔ یا اس سے تیار کردہ نقل کی نقل ہو.....اور اس میں مصاحف عثمانی میں استعمال شدہ طریق املاء وھجاء سے سرمو بھی تفاوت نہ ہو۔ اس طریق املاء کا نام ہی رسم عثمانی پڑ گیا۔ اور جن کو بوجوہ یہ نام اچھا نہ لگا انہوں نے بھی رسم قرآنی یا رسم مصحف کے نام سے اسی طریق املاء وھجاء کی پیروی کو لازمی مانا۔

یہی وجہ ہے کہ کاتبانِ مصاحف کی راہنمائی کے لیے اور علمائے تجوید و قرأت کے استفادہ کے لیے اس مخصوص فن یعنی علم الرسم پر الگ کتابیں تالیف کی گئیں۔

مختلف عوامل کے باعث بعض اسلامی خصوصاً ایشیائی ممالک میں رسم عثمانی کے اس التزام سے تساہل برتا جانے لگا۔ تاہم اندلس اور افریقی ممالک اس خرابی سے محفوظ رہے۔

رسم عثمانی کی غلطیوں پر مبنی نسخوں سے کتابت کے باعث آہستہ آہستہ یہ غلط املاء آنکھوں کو مانوس نظر آنے لگا۔ مصاحف خطیہ کے دور تک تو قدرتاً ان اغلاط کی اشاعت کا دائرہ محدود رہا مگر دورِ طباعت میں یہ اغلاط آناً فاناً اضعافاً مضاعفہ ہونے لگیں تو اہل علم اس صورت حال سے بے چین ہوگئے اور گزشتہ صدی میں اس کوتاہی اور تساہل کے خلاف آواز اٹھنے لگی۔ ۱۸۹۱ء/ ۱۳۰۸ھ میں رضوان بن محمد المخللاتی کے زیر اہتمام مصر سے ایک مصحف شائع ہوا۔ جس میں بڑی حد تک رسم عثمانی کا التزام کیا گیا تھا۔ اس کے بعد قاہرہ ہی سے حکومت مصر کے زیر اہتمام فواد الاول کے زمانے میں ۱۳۴۲ھ/ ۱۹۲۳ء میں اہل علم ماہرین فن کے

ایک بورڈ کی نگرانی میں بڑے اہتمام سے وہ مشہور نسخہ شائع ہوا جو عموماً مصحف الملک یا نسخہ امیریہ کے نام سے معروف ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء میں شائع ہوا اور اس میں رسم عثمانی کی ان چار غلطیوں کو بھی درست کر دیا گیا جو طبع اول میں رہ گئی تھیں۔ اس کے بعد سے شرق اوسط کے تمام عرب ممالک میں شائع ہونے والے مصاحف بالعموم اسی مصری مصحف طبع دوم سے نقل کئے جاتے رہے ہیں۔ اس مصری نسخے پر مبنی مگر بہت خوبصورت نسخہ دمشق سے الدار الشامیہ نے ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء میں شائع کیا اور ۱۹۸۵ء میں حکومت سعودی عرب نے یہی نسخہ مجمع الملک فھد لطباعۃ المصحف کے زیر اہتمام شائع کیا ہے۔ پاکستان میں مولوی ظفر اقبال صاحب مرحوم نے اسی مصری نسخہ پر مبنی تجویدی قرآن کا نسخہ تیار کروایا جسے پیکیجز لمیٹڈ نے ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء میں شائع کیا ہے۔ پاکستان میں شائع ہونے والا یہ واحد مصحف ہے جس میں رسم عثمانی کا التزام کیا گیا ہے۔

جن نسخوں کا ابھی ذکر ہوا ہے یہ سب قرأت کے لحاظ سے حفص عن عاصم والی روایت پر مبنی ہیں مصری نسخہ کا اہتمام دیکھ کر بعض دوسرے افریقی ملکوں میں جہاں حفص کے علاوہ دوسری روایات قرأت متداول ہیں۔ انہوں نے بھی رسم عثمانی کے التزام پر مبنی مگر اپنے ہاں رائج قرأت کی علامات ضبط کے ساتھ مصاحف شائع کئے ہیں۔ ورش عن نافع والی روایت تمام افریقی ملکوں خصوصاً نائجیر یا مراکش وغیرہ میں عام ہے۔ حکومت سوڈان نے ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء میں دوری عن ابی عمرو البصری کی روایت پر مبنی نسخہ قرآن شائع کیا اور تونس سے ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء میں قالون عن نافع کی روایت پر مبنی نسخہ عبداللہ ... کی کتابت سے شائع ہوا اور ابھی حال میں حکومت لیبیا نے بھی قالون عن نافع کی روایت پر مبنی ابوبکر ساسی کی کتابت کے ساتھ ایک نسخہ قرآن شائع کیا ہے۔ یہ نسخہ

Marfat.com

بھی رسم عثمانی پر ہی مبنی ہے۔ ان مصاحف کی اشاعت سے ایک دفعہ پھر کتابت مصاحف میں رسم عثمانی کے التزام کا احساس یا تجدید احساس ایک تحریک کی شکل اختیار کر رہا ہے۔

رسم عثمانی کے عام رسم املائی سے اختلاف اور کتابت مصحف میں خود رسم عثمانی میں بھی کئی جگہ کسی اصول کی پابندی کے فقدان کے اسباب کی تلاش میں.....رسم قرآنی کے توقیفی ہونے سے لے کر صحابہؓ کے قواعد املاء سے ناواقفیت جیسے انتہائی متضاد نظریات وجود میں آئے۔

.....تاہم گذشتہ صدی میں شمالی عرب اور شام کے بعض علاقوں سے قبل از اسلام دور کے بعض قبطی کتبات کی دریافت نے رسم عثمانی کے مآخذ و مصادر کی طرف رہنمائی کر دی ہے۔

رسم قرآن کے اس فنی پہلو کے ساتھ ساتھ خط قرآن نے حسن و جمال کے کئی قالب گزشتہ چودہ صدیوں میں اختیار کئے اور جمال خط کے ساتھ بعض دفعہ کتابت مصاحف میں صنائع و بدائع کا استعمال تو بعض دفعہ اعجازِ قرآنی کا ایک مظہر نظر آتا ہے۔ کتابت مصاحف یا خط قرآن جہاں خدمت قرآن کا ایک میدان ہے وہاں اس خدمت میں محبت و عقیدت کا ایک مظہر بھی ہے۔

افسوس اور تعجب کا مقام ہے کہ ہمارے ملک میں طباعت و اشاعت قرآن کے نام سے لاکھوں بلکہ کروڑوں کا کاروبار کرنیوالے ادارے ابھی تک رسم عثمانی کے مفہوم و معنی سے ناواقف ہیں اور ہماری حکومت جو آئینی اور قانونی طور پر قرآن کریم کی درست کتابت و طباعت کی ذمہ دار ہے وہ ابھی اس طرف کوئی عملی توجہ نہیں دے رہی.....حکومت ناشروں کے نام ایک سرکلر جاری کر دیتی ہے کہ نسخہ ہائے قرآن رسم عثمانی کے مطابق شائع کئے جائیں لیکن خود حکومت اس

معاملے میں کوئی راہنمائی کرنے سے قاصر ہے۔

قرآن کریم کی کتابت ہی کے سلسلے میں ہجاء ورسم کے علاوہ بعض اور امور مثلاً ضبط، وقف، شمار آیات مواقع سجدات وغیرہ کی نشاندہی اور مختلف تقسیمات مصحف بھی شامل ہیں۔ تاہم ان امور کا تعلق چونکہ قرآن کریم کی قرات سے ہے اس لیے ان کا ذکر ہم ابھی آگے تعلیم وتعلم قرآن کے ضمن میں کریں گے۔

کتابت کے بعد قرآن کی دوسری اہم بنیادی خدمت اس کا پڑھنا پڑھانا ہے۔ کتابت وحی کے برعکس قرأت اور تلاوت قرآن کی ابتداء خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی۔ کتابت تو آپ کسی سے کروا لیتے تھے مگر قرآن کی قرأت آپ خود جبریل سے سن کر حفظ کر لینے کے بعد خود صحابہ کو پڑھاتے تھے۔ آہستہ آہستہ آپؐ سے پڑھے ہوئے خود آگے پڑھانے پر مامور کئے گئے۔ ابتدائی مکی دور سے ہی حضورؐ کی لکھوائی ہوئی سورتوں اور آیات کی نقول بھی صحابہؓ میں پھیلنے لگیں اور قرآن حفظ بھی کیا جانے لگا۔ قرآن کریم کی قرأت کی تعلیم محض تحریر کی بجائے تلقی اور سماع کے ذریعے جاری رہی۔

مدنی دور کے آخری حصے میں قرآن کریم کی تعلیم اور تدریس قرأت علاقائی حکام بالا کی ذمہ داری قرار دی گئی۔ ہمارے لیے یہاں عہد نبوی میں قرآن پڑھنے پڑھانے کے اس نظام کی پوری تفصیلات میں جانا ممکن نہیں۔ البتہ یہاں قرأت قرآن کے سلسلے میں دو باتوں کا بیان کرنا ضروری ہے۔

۱۔ ایک تو یہ کہ آپؐ نے اپنے عملی اقدامات کے علاوہ تعلیم وتعلم قرآن، اس کی قرأت اور اس کے حفظ کے فضائل پر اتنا زور دیا کہ اس سے مسلمانوں کے اندر تعلیم وتعلم قرآن کے لیے ایک جوش وخروش پیدا ہو گیا۔

Marfat.com

۲۔ قرأت قرآن کے سلسلے میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ آنحضورؐ نے خود بھی قرآن کریم میں بعض کلمات کو ایک سے زیادہ طریقوں سے پڑھا اور پڑھایا.....اور عرب کے مختلف قبائل کو ان کے اپنے اپنے لہجے میں قرآن پڑھنے کی اجازت دی.....

عربوں کے اس لہجاتی فرق کو سمجھنے کے لیے کتابوں میں متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ آنحضورؐ خود بھی ان قبائل کے ساتھ بعض دفعہ ان ہی کے لہجے میں گفتگو فرمالیتے تھے۔ صرف دو مثالوں سے اندازہ کرلیجئے۔

۱۔ ایک آدمی نے آنحضرتؐ سے پوچھا:

امم برم صیامم بم سفر (یعنی امن البر الصیام فی السفر)

آپؐ نے جواباً فرمایا۔ لیس مم برم صیامم بم سفر (یعنی لیس من البر الصیام فی السفر)

۲۔ بنی سلیم کے ایک آدمی نے پوچھا:

یارسول اللہ ایدالك الرجل اهله؟

(یہاں یدالک بمعنی یماطل آیا ہے)

آپؐ نے فرمایا: اذا کان مفلجا (یعنی مفلسا)

ابوبکرؓ کے دریافت کرنے پر آپؐ نے اس کی وضاحت فرمائی تھی۔

قبائل عرب کے بعض لہجاتی خصوصیات کا ذکر کتابوں میں مختلف ناموں سے ملتا ہے۔ اس قسم کی چیزیں لغت قریش میں عیب شمار ہوتی تھیں اور قرآن لغت قریش میں ہی نازل ہوا تھا۔ بہرحال قبائل عرب کو اپنے لہجے کے ساتھ قرأت قرآن کی اسی اجازت سے ہی قرأت کا وہ اختلاف نمودار ہوا جس کے اندر افتراق امت کے ایک امکانی خطرہ کے سدباب کے لیے عہدعثمانی میں یہ

Marfat.com

اجازت واپس لے لی گئی اور مصحف صدیقی پر مبنی وہ عثمانی ایڈیشن تیار ہوا جو آج تک پوری امت کے لیے کتابت و قرأت قرآن کی صحت کا معیار چلا آتا ہے اور جس میں کسی لفظ بلکہ دندانہ (بذہ) کے بدلے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بطریق تواتر ثابت تمام اختلاف ہائے قرأت کی گنجائش موجود ہے۔

ابتدائی اموی دور میں غیر عربوں کو قرأت قرآن میں صحت و سرعت پر قادر کرنے کے لیے حرکات اور اعجام کی ابتدا ہوئی اور آہستہ آہستہ یہ ایک مستقل علم بن گیا جسے علم الضبط کہا جاتا ہے۔ مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں اور تمام مستند اختلاف ہائے قرأت کو ملحوظ رکھنے کی بنا پر علم الضبط یا علامات ضبط کے اصول و قواعد مرتب ہوئے۔ قرأت قرآن سے مربوط علم الاصوات یا صوتیات قرآن (Phonetics) کے تقاضوں کو علامات ضبط کے ذریعے واضح کرنے کی کوششیں جاری رہیں اور اب تک جاری ہیں۔ پرانے زمانے میں قلمی مصاحف میں بعض علامات ضبط سرخ سیاہی سے ڈالی جاتی تھیں۔ دور طباعت میں جب یہ ممکن نہ رہا۔ (اب ممکن ہے اگرچہ مہنگا ہے) تو علامات ضبط میں تجدید و ایجاد کا عمل ایک دفعہ پھر شروع ہوا۔ اس کے مظاہر مصر کے مصحف الملک سے علاوہ مصحف حلبی ۱۹۳۵/۱۳۵۴ھ نیز تونسی، لیبی، سوڈانی، سعودی مصحف اور پاکستان کے تجویدی قرآن مجید میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مختلف اسباب کی بنا پر دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں قراء سبعہ کی بعض خاص خاص روایات متداول ہوئی ہیں۔ مثلاً مصر اور ایشیائی ممالک میں روایت حفص عن عاصم۔ مراکش، غانا اور نائیجیریا میں ورش عن نافع۔ تونس و لیبیا میں قالون عن نافع۔ سوڈان میں الدوری عن ابی عمرو البصری رائج ہیں۔

اختلاف قرأت کے علاوہ بعض دفعہ ایک ہی روایت اور قرأت کے

Marfat.com

لیے مختلف ملکوں میں مختلف علامات ضبط استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً ترکی، ایران، برصغیر اور چین میں روایت حفص رائج ہونے کے باوجود ہر ملک کی علامات ضبط جدا ہیں۔ نائجیریا اور مراکش میں روایت ورش کے باوجود اندازِ کتابت اور طریق ضبط دونوں جدا ہیں۔

دراصل ہرجگہ خادمانِ قرآن نے قرآن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نطقِ صحیح کو مختلف علاماتِ ضبط کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے ملک میں اس کی جدید ترین اور مفید مثال تجویدی قرآن ہے۔

تمام علامات ضبط کے اس سارے نظام اور ان تمام مساعی کے باوجود قرآن کی درست قرأت اور صحیح نطق کا دار و مدار بالمشافہ تعلیم پر ہے۔ آپ کسی طریقہ علامات ضبط کو دیکھئے عموماً ہر مشکل تلفظ مثلاً ادغام ناقص۔ اخفاء۔ اظہار۔ قلقلہ۔ امالہ۔ اشمام۔ اختلاس۔ تسہیل ہمزہ یا بین بین اور اختلاس کی علامات لکھ کر بھی ساتھ ہی لکھا جاتا ہے کہ: یدرك بالمشافهه یا یو خذ بالتلقی و المشافهه اور کبھی صاف لکھا ہوتا ہے۔ ولایحکم ذلك کله اوربالمشافهة و السماع من لفظ الشیوخ"۔

دورحاضر کی ایجادات کو خدمت قرآن کے لیے استعمال کرتے ہوئے قرآن کے خادموں نے ریکارڈنگ کے ذریعے قراءات میں اس نطق صحیح کو بھی محفوظ کر لیا ہے جو بسند تواتر عہد نبوی سے علم القراءات کے اساتذہ فن کے ذریعے بذریعہ تلقی و سماع محفوظ چلا آتا تھا۔

اس وقت تک حفص، ورش اور دوری کی روایات قراءت میں مکمل قرآن ریکارڈ ہو چکا ہے۔ اب جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تدریسی اور تعلیمی مقاصد کے لیے سبعہ قراءت پر مشتمل ریکارڈنگ جاری ہے۔

Marfat.com

قرآن کی درست قراءت کی تعلیم کے سلسلے میں خدام قرآن کے نوٹس میں یہ بات لانا ضروری ہے کہ بچوں کو شروع سے ہی درست قراءت کے ساتھ قرآن پڑھانا فرض ہے۔کم از کم بقدر نماز درست قرآن یاد کرنا اور اسے درست پڑھنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

کہتے ہیں کہ مشہور تابعی ابو عبدالرحمن السلمی باوجود اپنی تمام تر علمی بزرگی اور بلندی مرتبہ کے، پورے چالیس سال تک جامع کوفہ میں صرف قرآن پڑھانے میں مصروف رہے اور یہ صرف حدیث ''خیرکم من تعلم القرآن و علمہ'' سے متاثر ہوکر۔افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں یہ فرض بھی ٹھیک طور پر سرانجام نہیں دیا جارہا۔بچوں کے لیے بازار میں دستیاب قرآنی قاعدے تک اغلاط سے مبرا نہیں ہیں سوائے ایک آدھ کے۔

ضروری ہے کہ بچوں کے لیے مدارس میں نطق صحیح اور قراءت صحیح کی مشق رکھنے والے قراء معقول مشاہروں پر رکھے جائیں اور تلقی و سماع کے مسنون طریقے کا احیاء کیا جائے۔

بچوں کو صحت تلفظ اور نطق صحیح کے ساتھ قرآن حفظ کرانے کا بندوبست کرنا خدمت قرآن کا نہایت اہم میدان ہے۔ بدقسمتی سے بعض مجبوریوں کی وجہ سے اساتذہ قرآن تلامذہ پر پوری توجہ نہیں دے سکتے۔

اسی طرح حفظ قرآن کی حوصلہ افزائی کے علاوہ اس کی تحقیق الفاظ پر تکمیل وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے۔

یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اکثر پڑھے لکھے لوگ قراءت قرآن سے نا آشنا نظر آتے ہیں۔حالانکہ اسلامی نظام تعلیم کی بدولت تو ہر قرآن خوان اپنی علاقائی زبان پڑھنے (ریڈنگ) پر قادر ہو جاتا تھا۔

Marfat.com

لکھنے اور پڑھنے کے بعد یا کتابت و قراء ت کے علاوہ قرآن کی خدمت کا اگلا میدان قرآن سمجھنا اور سمجھانا ہے۔اس میدان میں اگلوں کی خدمات کا اندازہ کرنے کے لیے تراجم و تفاسیر قرآن کے ضخیم ذخائر کے علاوہ معاجم قرآن (ڈکشنری) اور قرآنی موضوعات پر مستقل تالیفات کی طرف اشارہ کرنا ہی کافی ہے۔

تاہم اتنے ذخیرہ کے فراہم ہو جانے کے باوجود کسی چیز کو حرف آخر نہیں کہا جا سکتا اور کسی بھی تفسیر یا ترجمہ کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی اور ترجمہ یا تفسیر کی ضرورت نہیں۔

اس وقت ایک قابل غور امر جس کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے یہ ہے کہ آج کی زندگی میں ماہرین کے پاس بھی ضخیم کتابوں کے مطالعہ کا وقت نہیں ہے۔زندگی کے اس رواں دواں دور میں چھوٹے پمفلٹ یا مضامین وغیرہ کے ذریعے قرآنی تعلیمات کی اشاعت کا کام کیا جائے اور درست قرآنی فہم کو عام کرنے کی کوشش کی جائے۔

قرآن کریم کے سمجھنے سمجھانے کے سلسلے میں ہی خدمت قرآن کا ایک عظیم میدان عربی زبان کی تدریس و اشاعت ہے ۔ قرآن کی برکت سے اور اس کی وجہ سے عہد نبوی کی عربی زبان ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئی ہے۔

قرآن کی زبان کی خدمت کے لیے مسلمانوں میں علم صرف و نحو کی ابتداء و ارتقاء کے منازل طے ہوئے۔ اس مقصد کے لیے ہی عربی معاجم کی تالیف، شعر جاہلیت کی تدوین وغیرہ کا سارا کام ہوا۔

مسلمانوں کے لیے عربی کی علمی و ادبی اور ملی و سیاسی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ قیام پاکستان کے بعد سب سے پہلے غالباً آغا خان کی طرف

سے یہ تجویز آئی تھی کہ پاکستان کی سرکاری زبان عربی بنائی جائے۔ ۱۹۵۱ء میں مشرقی پاکستان سے صوبائی اسمبلی کے ۶۵ ارکان نے اپنے دستخطوں کے ساتھ ایک قرارداد مرکزی حکومت کو بھیجی تھی جس میں عربی کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دینے کی سفارش کی گئی تھی پھر ۱۹۵۵ء میں کراچی کے متعدد رہنماؤں نے ایک مشترکہ قرارداد کے ذریعے مرحوم حسین شہید سہروردی سے عربی کو پاکستان کی سرکاری زبان بنالینے کی اپیل کی تھی۔

اگر اس وقت عربی کو ملی اور دینی زبان کی حیثیت سے دوسری پدری اور مادری زبانوں پر ترجیح دی جاتی اور عربی کو سرکاری زبان بنالینے کے کسی ۲۰، ۲۵ سالہ منصوبے کی بنیاد رکھ دی جاتی تو شاید آج پاکستان کی تاریخ مختلف ہوتی۔

بہرحال عربی زبان کی تدریس و تعلیم کے مراحل اور درجات (Levels) اور مقاصد و غایات متعدد ہو سکتے ہیں۔

لیکن قرآن کو براہ راست سمجھنے کے لیے عربی زبان کی تعلیم و پڑھے لکھے طبقے میں اتنی حد تک زیادہ عام کرنا چاہئے کہ ایک پڑھا لکھا مسلمان مختلف تراجم قرآن کے تقابلی حسن و خوبی کو جانچ سکے وہ نعبد اور یعبدون اور یدعون کا ایک ہی ترجمہ کرنے والوں کی غلطی پوری طرح سمجھ سکے۔

عربی دوبئی کے لیے بھی سیکھی جاتی ہے اور پی ایچ ڈی کے لیے بھی دونوں مقصد اپنی جگہ مفید ہیں مگر دوبئی والی عربی سے قرآن نہیں سمجھا جا سکتا اور پی ایچ ڈی والی عربی پورے قرآن کا ترجمہ والا کتاب پڑھنے کی فرصت ہی نہیں پیدا ہونے دے گی۔ قرآن فہمی کے لیے عربی سیکھنا نسبتاً آسان بھی ہے۔ قرآن کریم کی پوری حرکات اور علامات ضبط کے ساتھ کتابت عربی سیکھنے میں مدد بھی

Marfat.com

دیتی ہے۔ قرآن فہمی کے لیے صرف اور نحو کی حد تک عربی زبان کی مضبوط بنیاد پر تحصیل کے بعد پورے قرآن کے ترجمہ سے اس طرح گزرنا کہ صرف و نحو کی حد تک ہر بات سمجھ لی جائے۔ یہ ایک نیا تجربہ ہے جو انجمن خدام القرآن نے شروع کیا ہے۔ اور قرآن کی خدمت کا ایک نیا میدان ہے۔

پچیس سال تک کالج اور یونیورسٹی میں عربی و اسلامیات کی تدریس میں بسر کرنے اور ڈگری کی حد تک استعداد و اہلیت رکھنے کے باوجود بالاستیعاب الحمد سے والناس تک قرآن کے ایک ایک لفظ کو سمجھتے ہوئے گزرنے کا اس سے پہلے خود مجھے بھی موقع ہی نہیں ملا بلکہ فرصت ہی نہیں مل سکی تھی۔

اس کورس میں اگر کسی طرح جلالین یا کوئی مختصر عربی تفسیری حاشیہ بھی پڑھا دیا جائے تو آئندہ عربی عبارت پڑھنے کی بھی راہ ہموار ہو جائے گی اور حسب ضرورت عربی تفاسیر سے استفادہ بھی ممکن ہو جائے گا۔

موجودہ زمانے کے لحاظ سے قرآن کی خدمت کا ایک نہایت اہم اور ضروری میدان، قرآن کی حقانیت کی حفاظت یا اس پر دشمنوں کی اعتراضات کا باطل شکن جواب دینا بھی ہے یوں تو خود قرآن نے اہل مکہ کے قرآن پر اعتراضات کا ذکر کرکے ان کا جواب دیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ صرف الفاظ و عبارات کا جامہ بدل جائے تو اور بات ہے ورنہ اپنی اصل اور روح کے لحاظ سے آج کے دشمنوں کے تمام اعتراضات کے جواب کی اصل خود قرآن سے مل سکتی ہے۔ عبدالجبار معتزلی (م۴۱۵ھ) کی تنزیہ القرآن عن المطاعن سے لے کر عبدالفتاح قاضی اور ڈاکٹر عبدالفتاح اسماعیل شلبی اور عبدالعظیم زرقانی وغیرہ کا مستشرقین کے مغالطوں کے پردے چاک کرنا، یہ سب اسی میدان میں خدمت قرآن کے نمونے ہیں۔

Marfat.com

تاہم اس میدان میں اردو زبان میں ابھی بہت کم کام ہوا ہے — اور مزید توجہ طلب ہے۔

خدمت قرآن کے ان میدانوں میں مستحکم بنیادوں پر قرآن کے لئے خدمات سرانجام دینے کے لئے ہر کوشش مسلمان کے لئے ایک بڑی سعادت ہے۔

تشریع قرآنی کے نفاذ سے بظاہر قرآن کے لئے مختلف خدمات سرانجام دینے میں بھی مزید استحکام کی توقع کی جاسکتی ہے۔

لیکن چاہے جو میدان ہو یا جو مرحلہ، قرآن کی خدمت کرتے ہوئے یا خدمت کی توفیق پاتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور اس سے خلوص نیت حاصل ہونے کی دعا کرنی چاہئے۔ یوں تو نیکی کے کسی میدان میں بھی ایسا ہونا ممکن ہے۔ تاہم قرآن کے لئے اور قرآن کے نام سے کوئی کام کرتے ہوئے ضرور کسی نہ کسی مرحلے پر شیطان سے واسطہ پڑنے کے امکانات زیادہ ہیں چاہے وہ اپنا نفس ہو یا کوئی خارجی قوت۔

اور شاید اسی لئے قرآن پڑھنے سے پہلے ہی شیطان سے اس متوقع تصادم سے محفوظ رہنے کے لئے اللہ کی پناہ طلب کرنے کا حکم ہے۔

Marfat.com

قرآنی اَدب و ثقافت کا ایک پہلو

قرآن کریم بنیادی طور پر کتاب ہدایت ہے اور اس کا اصل موضوع عقیدہ اور شریعت ہے تاہم ادب و لغت اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بھی قرآن کریم بے مثل اور بے نظیر کتاب ہے۔ اعجاز القرآن کے ضمن میں قرآن کریم کی تحدی کو زیادہ تر اسی فصاحت و بلاغت کے پہلو سے ہی سمجھا، سمجھایا جاتا رہا ہے۔ کم از کم نزول قرآن کے معاصرین کے سامنے قرآن کے اس چیلنج کا مفہوم یقیناً یہی تھا۔ دوسرے پہلو (جن کا ذکر متاخرین اور ہمارے معاصرین کی تالیفات میں ملتا ہے) تو تاریخ کے عمل اور انسانی علوم کی وسعت کے ساتھ ساتھ نکھرتے چلے گئے ہیں۔

قرآن کریم نے عربوں اور مسلمانوں کے علوم و آداب پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ قرآن اور حدیث جب اذہان اور افکار میں راسخ ہوئے تو اہل عرب کی قدیم عادات اور رسوم کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی و لسانی ذوق کی بھی تہذیب و تطہیر ہوئی۔ قرآنی اسلوب کے تتبع میں اب شعر میں بھی غریب اور نامانوس الفاظ سے اجتناب کیا جانے لگا۔ ہجو تک میں فحش گوئی اور خلاف تہذیب عناصر سے پرہیز کیا جانے لگا۔ اس کے برعکس قرآنی الفاظ اور اسالیب و تراکیب اور نئی تعبیریں زبان میں بکثرت استعمال ہونے لگیں۔ خطابات میں اسالیب قرآن اور آیات و احادیث کے اقتباسات سے کام لیا جانے لگا۔ جو خطبہ قرآنی آیات سے

Marfat.com

خالی ہوتا مسلمان اسے "شوھاء" (منحوس) کہتے تھے۔آیات کے اقتباسات اور اسالیب قرآن کے تتبع نے شاعری کے علاوہ انشاپردازی اور نثرنویسی کو بھی ایک نیا رخ دیا اور ایک نئی رونق بخشی۔قرآن کریم نے جو ذہنی اور سیاسی انقلاب برپا کیا اس کی بدولت زبان کے اغراض و مقاصد بھی وسیع ہو گئے۔اب محض چند بدویانہ مضامین کے بجائے عقائد دینیہ،احکام شرعیہ اور امور سیاسیہ و اجتماعیہ سب عربی زبان میں ادا ہونے لگے۔

بنو امیہ کے دور میں دفتری زبان بن جانے کے بعد سے عربی کو مسلمانوں اور بلاد اسلامیہ کی سرکاری اور علمی زبان کا درجہ حاصل ہوگیا۔سرکار دربار میں کوئی اعلیٰ عہدہ پانے کے لیے یا علمی دنیا میں نام پیدا کرنے اور کوئی ٹھوس علمی کام کرنے کے لیے اب عربی زبان کی مہارت لازمی ہوگئی۔مسلمانوں کے نظام تعلیم کی بنیاد قرآن و سنت پر تھی۔بچے کی تعلیم کا آغاز قراءت اور حفظ قرآن سے ہوتا تھا۔اعلیٰ سطح پر عربی کی اس اجتماعی، سیاسی اور علمی اہمیت نے عربی زبان میں مہارت کو وقت کی ضرورت بنادیا تھا۔تفاسیر قرآن میں ادبی اور لغوی رجحان اسی لیے پیدا ہوا کہ اس کے ذریعے ہی ایک مسلمان دینی اور عربی دو لحاظ سے اہل علم کی صف میں شامل ہونے کے قابل ہوسکتا تھا۔آہستہ آہستہ قرآنی آیات کا تتبع اور ان سے استشہاد صرف فقہی مسائل اور مناظرانہ یا کلامی مباحث تک ہی محدود نہ رہا بلکہ مسلمانوں کی تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں اور مجالس میں قرآنی آیات کے اقتباسات یا اسالیب قرآن پر مبنی کلام اور عبارت کے استعمال کو اس بات کا معیار سمجھا جانے لگا کہ کسی آدمی میں آیات کے استحضار اور ان کے برمحل اطلاق کی کس قدر استعداد موجود ہے۔مطالب اور معانی کے لحاظ سے قرآنی آیات کے مناسب اور موزوں اقتباسات — یا مختلف مواقع پر قرآنی

اسالیب و مضامین کے استعمال سے نہ صرف تحریر و تقریر میں ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے بلکہ قرآن کریم کے اس قسم کے ادبی استعمال سے سامع یا قاری کا ذہن بھی اسلامی سانچے میں ڈھلتا ہے ۔قرآن کریم میں بہت سی ایسی آیات ہیں جو اپنی عبارت اور الفاظ کے اختصار اور مضمون کے جامعیت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوسکتی ہیں اور تحریر و تقریر میں ان کا برمحل استعمال قرآنی ادب اور ثقافت کا ایک دلچسپ پہلو ہے ۔۔۔ پھر جب مسلمانوں میں تقوی کی کمی کے ساتھ مختلف اجتماعی خرابیاں نمودار ہونے لگیں تو تحریر و تقریر اور نظم و نثر میں قرآنی آیات کے غلط اور بے موقع اقتباس اور بعض دفعہ قرآنی مضامین کے سوء فہم پر مبنی غلط شاعرانہ تخیلات بھی سوسائٹی میں نمودار ہونے لگے ۔ یہی وجہ ہے کہ علوم قرآن اور مباحث قرآنی کے ضمن میں اس مسئلہ کو بھی علمائے حق نے موضوع بحث بنایا کہ قرآنی آیات اور مضامین کا اس طرح سے ادبی استعمال جائز بھی ہے یا نہیں۔

زرکشی نے البرہان کی پہلی جلد کے آخر پر ایک ''نوع'' (30 ویں) کا عنوان یہی رکھا ہے ۔"هل يجوز في التصانيف و الرسائل و الخطب استعمال بعض آيات القرآن و هل يقتبس منه في شعر و يغير نظمه بتقديم و تاخير (کیا تصانیف یا خط و کتابت یا تقاریر میں بعض آیات کا استعمال جائز ہے؟ اور کیا اس سے شعرو شاعری میں کوئی اقتباس بعینہ یا الفاظ کی قولی تبدیلی کے ساتھ لینا درست ہے؟) .....اسی طرح سیوطی نے الاتقان کی فصل چہارم "فی الاقتباس و ماجری مجراہ" (اقتباس اور اسی قسم کے دوسرے امور کے بارے میں رکھا ہے۔ اور اسی فصل میں خود اقتباس کی تعریف یہی کی ہے کہ "قولہ تعالی یا قال اللّٰہ" کہے بغیر قرآن کریم کی کسی آیت یا اس کے جزء کو نظم و نثر میں برمحل

Marfat.com

استعمال کیا جائے" سیوطی ہی اس قسم کے اقتباس کے شرعی حکم کے اعتبار سے تین درجے یا قسمیں بیان کی ہیں۔ مقبول، مباح اور مردود۔ اقتباس مردود کے ضمن میں مثالیں دیتے ہوئے سیوطی نے ایک تو کسی ایسے زن بر اعصاب سوار یاوہ گو شاعر کے دو ایسے شعر بھی لکھے ہیں ان کا لکھنا پڑھنا بھی نقل کفر ہے— اور ایک مثال کسی حکمران کی لکھی ہے کہ جس نے غضبناک ہو کر اپنے کسی عامل یا مخالف کو دھمکی دیتے ہوئے لکھا تھا "ان الینا ایابھم۔ ثم ان علینا حسابھم (الغاشیہ : ۲۵، ۲۶) (بیشک ان لوگوں کو پلٹنا ہماری ہی طرف ہے، پھر ان کا حساب ہمارے ہی ذمہ ہے) قرآن کریم کی ایسی آیات کو جس میں اللہ جل شانہ نے ضمیر متکلم میں کلام کیا ہو اسے اپنی طرف بطور نقل نسبت دینا گناہ ہی نہیں ادبی کور ذوقی کی دلیل بھی ہے۔ اسی قسم کے غلط اقتباس کی ایک مثال زرکشی نے اس شعر کی دی ہے۔

ولو أن مابی من جوی وصبابۃ
علی جمل لم یبق فی النار خالد

اگر اونٹ اس بلائے عشق سے دوچار ہو جائے جس سے مجھے واسطہ پڑا ہے تو کوئی بھی ہمیشہ دوزخ میں نہ رہے۔ خیال رہے شاعر نے شعر کے اس تخیل میں آیہ کریمہ "ولا یدخلون الجنۃ حتی یلج الجمل فی سم الخیاط (الاعراف: ۴) کے مضمون سے حاصل کیا ہے۔ (اور وہ ملحدین و منکرین جنت میں داخل نہ ہوں گے جب تک سوئی کے ناکے میں اونٹ داخل نہ ہو جائے) یہ شاعرانہ تخیل نرا ملحدانہ ہی نہیں تمام قرآن کے مفہوم پر چوٹ ہے کہ شاعر نے سبب خلود تکذیب و استکبار کی بجائے اونٹ کا عدم دخول (داخل نہ ہونا) ٹھہرایا ہے۔ اقتباس کے اس قسم کے ضمن غلط استعمال کو سامنے رکھتے ہوئے ہی غالباً مالکیہ نے (بقول سیوطی) قرآنی اقتباسات کے کلام انسانی میں استعمال کی مطلق تحریم منقول

Marfat.com

ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک انتہاء ہے کیونکہ جیسا کہ ہم ابھی بیان کریں گے۔ اقتباس حسن کی مثالیں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے کلام میں ثابت ہیں۔ تاہم ہم نے اپنی بات کے شروع ہی میں اس ملحدانہ یا فاسقانہ سخن فہمی اور سخن آفرینی کی مثالوں کا ذکر اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ قرآنی آیات کے برمحل اور برجستہ صحیح ادبی استعمال کے لیے تین شرائط کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے:

۱) قرآنی آیات کا استحضار۔

۲) عربی زبان کی مہارت.....اور اسی لیے زرکشی نے لکھا کہ "جوز ذلك بعضهم للمتمكن من العربية" (یعنی بعض نے اسے صرف ماہر عربی کے لیے جائز قرار دیا ہے)

۳) اور سب سے اہم.....صحیح دینی ذہن

ان شرائط کے ساتھ قرآنی آیات کا اقتباس یا اسالیب قرآن کا صوری یا معنوی تتبع نہ صرف جائز اور مقبول ہے بلکہ بعض دفعہ یہ تزیین کلام کے لحاظ سے حسن اور تاثیر معنی کے لحاظ سے قوت پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اور کلام صحابہؓ سے ثابت اقتباساتِ قرآنیہ کی مثالوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ آنحضرتؐ کا "وجهت وجهی" پڑھنا نماز سے پہلے ثابت ہے جب کہ اصل آیت قرآنی "انی وجهت وجهی" (الانعام: ۷۹) ہے۔

۲۔ آپؐ کی دعا بالفاظ "اللهم اتنا فی الدنیا حسنة" بھی ثابت ہے جب کہ آیت قرآنی "ربنا آتنا" (البقرہ:۲۰۱) سے شروع ہوتی ہے۔

۳۔ آپؐ نے ہرقل قیصر روم والے مکتوب میں "سلام علی من اتبع الهدی"

Marfat.com

لکھوایا۔ جب کہ اصل آیت میں ''والسلام (طہٰ: ۴۷) ہے۔ اور اسی مکتوب میں آپؐ نے آیہ کریمہ "یا اھل الکتب تعالوا الی کلمة سواء بیننا وبینکم" بھی (آل عمران: ۶۴ سے) (بظاہر) بطور قصد کلام (نہ کہ بقصد تلاوت) استعمال کی تھی۔

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا یوں بھی ثابت ہے۔ "اللھم خالق الاصباح جاعل الیل سکناً والشمس والقمر حسباناً.....اقض عنی الدین وأغننی من الفقر..... اس دعا کا ابتدائی حصہ سورۃ الانعام کی آیت نمبر ۹۶ سے بتغیر الفاظ ماخوذ ہے۔

۵۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بسیاق کلام (بغیر قصد تلاوت) "وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون" (الشعراء: ۲۲۷) (اور ان ظلم کرنے والوں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ ان کو کیسی جگہ لوٹ کر جانا ہے)

۶۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے غالباً بیعت ابی بکر کے وقت کہا تھا "إنی مبایع صاحبکم اللہ یقضی امرا کان مفعولا۔ اس کلام کا آخری حصہ (سورہ الانفال: ٤٤) سے بغیر قصد تلاوت ہی استعمال کیا گیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ (بطور کلام) قد کان لکم فی رسول اللّٰہ" کہا تھا جو (سورہ الاحزاب ۲۱) سے بتغیر الفاظ ماخوذ ہے۔

اس قسم کی مثالوں سے ہی اہل علم نے قرآنی آیت کے اقتباس میں قصد کی شرط رکھی ہے۔ آدمی اسے تلاوت نہ سمجھے (قصد تلاوت کے لیے قال تعالیٰ یا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا یا جیسے قرآن کریم میں ہے وغیرہ کہنا ضروری ہوگا اس لیے امام نووی نے باب حملة القرآن میں یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ اگر جنبی یا حائض بغیر قصد تلاوت [illegible] سے "[illegible] الحمد اللہ وحدہ"

(مریم:۱۲) تو یہ درست ہوگا جب مراد کوئی اور کتاب لے رہا ہو .....یا ایسا ہی آدمی کسی سواری پر سوار ہوتے وقت آیہ کریمہ "سبحان الذی سخرلنا هذا وما کنا له مقرنین (الزخرف:۱۳) کو بغیر قصہ تلاوت محض ادائے مضمون (کہ پاک ہے جس نے اس سواری کو ہمارے تابع کر دیا ورنہ ہم تو ایسے نہ تھے کہ اسے قابو میں کر لیتے) کے لیے پڑھے تو یہ جائز ہوگا۔ خیال رہے ان دو عذر شرعی کے بغیر آدمی ایسے موقع پر ہی آیت بقصد تلاوت پڑھ سکتا ہے۔

اس موضوع پر اپنے مختصر سے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد راقم الحروف اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ تحریر اور تقریر میں قرآنی آیات کے اقتباس .....اور قرآنی اسالیب کے صوری یا معنوی تتبع کی جائز اور مستحسن صورتوں کو پانچ عنوانات کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ ضرب المثل یا حکم و امثال، کے طور پر برجستہ و برمحل اطلاق کے ساتھ قرآنی آیات کا اقتباس۔

۲۔ جامع اسلامی تعلیمات پر مشتمل مختصر آیات یا ان کے حصے

۳۔ عام روزہ مرہ کی گفتگو میں قرآنی آیات کا استعمال (بغیر قصد تلاوت)

۴۔ نکتہ آفرینی اور حاضر جوابی میں قرآنی آیات کا استعمال یا نظم و نثر میں اس کا اقتباس۔

۵۔ اشعار اور عربی عبارات میں آیات کا اقتباس یا اسلوب قرآنی کا صوری و معنوی تتبع۔

اب ہم ہر ایک موضوع سے متعلق صرف چند آیات اور کچھ واقعات اور عبارات بطور مثال اور برائے توضیح پیش کرتے ہیں۔

Marfat.com

روزمرہ کی گفتگو مین قابل استعمال قرآنی فقرے

(بشرط عدم قصد تلاوت محض تمرین عربیت کے لیے)

کتابوں میں ایک خاتون کا قصہ عموما مذکور ہے جو اپنے اظہار ما فی الضمیر کے لیے مختلف قرآنی آیات کا ہی استعمال کرتی تھی اور غیر قرآن عبارت بولنے سے ہی اجتناب کرتی تھی۔ یہ اس خاتون کے استحضار آیات کی ایک حیرت انگیز مثال ہے۔ تاہم بعض دفعہ سامع کو آیت سن کر بھی اصل مطلب تک پہنچنے کے لیے کچھ دماغی ورزش کرنا پڑتی تھی۔ قرآن کریم میں متعدد تقریریں سوال و جواب مکالمے اور قصے بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر کو عام روزمرہ کی گفتگو میں حسب موقع استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن ضروری ہے کہ اس میں عدم قصد تلاوت اور محض مشق عربیت ملحوظ رہے۔ اس قسم کی چند آیات درج ذیل ہیں ویسے مواقع کے لحاظ سے اس قسم کی آیات کی تعداد غالبا سینکڑوں تک پہنچ سکتی ہے خصوصا جب کہ ضرب المثل اور جامع تعلیمات پر مشتمل آیات وغیرہ بھی اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہاں بھی ہم ترجمہ اور موقع استعمال کی بحث کو بخوف طوالت نظر انداز کرتے ہوئے صرف حوالہ آیات دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔قد بلغت من لدنی عذرا (الکہف: ۷۶) ۲۔فاصبر علی مایقولون (ق:۳۹) ۳۔لا نرید منکم جزاء ولا شکورا (الدھر:۹) ۴۔ مالکم کیف تحکمون (القلم:۳۶) ۵۔الیس منکم رجل رشید (ھود:۷۸) ۶۔ان ارید الا الاصلاح ما استطعت (ھود:۸۸) ۷۔وما ابری نفسی ان النفس لا مارۃ بالسوء (یوسف:۵۳) ۸۔

Marfat.com

این المفر (القیامه:۱۰) ۹۔ الحمد لله الذی اذهب عنا الحزن(فاطر:۳٤) ۱۰۔ تلك اذا قسمة ضیزی (النجم:۲۲) هذا فوج مقتحم معکم(ص:۵۹) ۱۲۔ان ذلك من عزم الامور(الشوری :٤۳) ۱۳۔لمثل هذافلیعمل العاملون(الصافات:٦۱) ۱٤۔فلاتزکوا انفسکم هوا علم بمن اتقی(النجم:۳۲) ۱۵۔فاتوا برهانکم ان کنتم صادقین(النمل:٦٤) ۱٦۔ما یکون لی ان اقول مالیس لی بحق(المائده:۱۱٦)

نکتہ آفرینی اور حاضر جوابی کیلئے قرآنی آیات کا استعمال

یہ بہت نازک مقام ہے اور اس کے لیے غیر معمولی استحضار آیات کے علاوہ دینی ذہن اور ایک معیار ذوق بھی درکار ہے ذیل میں ایک دو اس قسم کی مثالوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ عباسی خلیفہ عبداللہ المامون(جسے غلطی سے عام لوگ مامون الرشید لکھ دیتے ہیں) کی شب زفاف کا یہ واقعہ اپنی نوعیت کے باعث بہت سے واقعہ نگاروں کے لیے ادبی حاشیہ آرائی کا سبب بنا ہے۔ نوجوان خلیفہ نے جب بے صبری کا مظاہرہ کیا تو دلہن نے برمحل کہا۔۔۔ امیر المومنین اتی امر الله فلا تستعجلوه(النحل:۱) (یہاں بھی ترجمہ اور اس کی ادبی لطافت کے بیان کی بجائے صرف حوالہ آیت کافی ہے)

۲۔ کسی اچھی شکل صورت کی ایک عورت کو جاتے دیکھ کر کسی دل پھینک قسم کے آدمی نے آیت قرآنی ..... وزینا هاللناظرین (الحجر:۱٦) پڑھ کر گویا

ایک طرح سے فقرہ کسا...... مگر وہ عورت بھی بلا کی حاضر جواب تھی۔ اس نے فوراً اس سے اگلی آیت ...... وحفظناها من كل شيطان رجيم (الحجر: ۱۷) پڑھ کر اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر نوجوان کو شرمندہ کر دیا...... دونوں کی نکتہ آفرینی کا لطف اٹھانے کے لیے حوالہ آیت کی مدد سے ترجمہ پر نظر ڈال لیجئے اور عورت کی استحضار کی داد دیجئے۔

۳۔ کبھی کبھی اس مقصد (نکتہ آفرینی) کے لیے آیت نہیں بلکہ کسی آیت کے مضمون پر مبنی مضمون کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی عباسی گورنر نے اپنے ایک صاحب شرطہ (پولیس کے بڑے افسر) کو مزاحاً کہا این تذهب يا هامان؟ (ہامان صاحب کہاں جا رہے ہو؟) تو اس نے جواب میں فوراً کہا لابنی لك صرحا (تیرے لیے ایک بلند عمارت بنانے جا رہا ہوں) (اس میں صاحب شرطہ گورنر کو ...... ہامان یا متکبر مشیر کہہ کر طعنہ کرنے کے جواب میں فرعون کہہ گیا مگر ڈھب سے ...... پوری بات البتہ سورۃ القصص: ۳۸ اور سورۃ المؤمن: ۳۶ کے مضمون پر مبنی ہے)

۴۔ کسی طویل القامت مجرم کو کوڑوں کی سزا ملی۔ کوڑے مارنے والا آدمی پست قد کا تھا اس نے مجرم سے کہا ذرا نیچے ہو (تاکہ کوڑا ٹھیک پڑے) وہ سزا یافتہ آدمی کہنے لگا ويلك الى اكل الفالوذج تدعوني؟ والله لوددت ان تكون انت اقصر من ياجوج وماجوج وانا اطول من عوج۔ (کم بخت تو کون سا مجھے حلوہ کھانے کو بلا رہا ہے جو نیچے جھکوں؟ خدا کی قسم میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تو یاجوج ماجوج سے بھی ٹھگنا ہو جائے اور میں عوج سے بھی زیادہ لمبا ہو جاؤں) خیال رہے اس میں یاجوج ماجوج اور عوج بن عنق کے قد و قامت کے بارے میں غیر مستند عوامی روایت کے مضمون پر

اساسِ جواب بنایا گیا ہے۔ فافهموا۔

اشعار اور عبارات میں اس قسم کا استعمال آیات

اس کی مثالیں عربی کے علاوہ فارسی، اردو بلکہ پنجابی تک کی شاعری میں بھی متعدد جگہ مل سکتی ہیں۔ مثلاً

۱۔ وحیب کلما خاطبته قال سلام
فاذا ما قلت زرنی قال لی ذاك حرام

اور ایسا دوست کہ جب اسے مخاطب کروں تو کہتا ہے سلام
اور جب اسے کہتا ہوں مجھ سے ملاقات کرو تو کہتا ہے یہ حرام ہے

اس شعر میں سورۃ الفرقان: ۶۳ کے مضمون کی طرف لطیف اشارہ ہے۔

۲۔ اما والذی أبکی وأضحك والذی
أمات و أحیا والذی أمره الأمر

ہاں وہ ذات پاک جو رلاتا ہے اور ہنساتا ہے اور جو
مارتا ہے اور جلاتا ہے اور جس کا حکم ہی دراصل حکم ہے

اس شعر کا مضمون سورۃ النجم: ۴۳:۴۴ سے ماخوذ ہے بلکہ الفاظ بھی وہیں سے لیے گئے ہیں صرف مصرع اول میں ضرورت شعری سے کچھ تقدیم و تاخیر کی ہے۔ فارسی زبان میں اس کی ایک مشہور مثال ہی پیش کرنا کافی ہے۔ یہ مثنوی کا شعر ہے۔

هرچه داری خرج کن در راه او
لن تنالوا البر حتی تنفقوا

اردو میں ظفر علی خان کا صرف ایک شعر لکھا جاتا ہے۔

ہے ازبر کلوا بھی تجھے واشربوا بھی

Marfat.com

کبھی یاد آیا مگر جاھدوا بھی!

نثری عبارتوں میں قرآنی آیات کے موزوں اقتباس اور استعمال کی مثالیں مختلف کتابوں کے دیباچوں میں بکثرت مل جاتی ہیں۔ تاہم اس کی صحیح صورت وہ ہے جہاں وعظ یا اپیل کا مضمون ہو اور وہاں زور اور تاثیر پیدا کرنے کے لیے قرآنی آیات کو برمحل استعمال کیا جائے۔ بعض اہل علم کو اللہ تعالیٰ نے یہ ملکہ کچھ خاص اور زیادہ ہی ودیعت کیا ہوتا ہے۔ ازانجملہ سید جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ تھے۔ ان کی تحریروں خصوصاً العروۃ الوثقیٰ کے ادارتی مقالوں—اداریوں— میں اس کی افادیت کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ ذیل میں العروۃ الوثقیٰ سے ہی ایک دو اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ یہاں بھی ہم ترجمہ کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہاں اصل حسن عربی عبارت میں قرآنی عبارت کے امتزاج سے پیدا کیا گیا ہے۔ اور ترجمہ میں وہ حسن و خوبی کسی طرح بھی پیدا نہیں کی جا سکتی اس لیے مبتدی حضرات سے معذرت کے ساتھ صرف اصل عربی عبارت کے اقتباس پیش کرتے ہیں۔ البتہ اہل ذوق شائقین کے لیے العروۃ الوثقیٰ کے مجموعہ مقالات کے متعلقہ صفحوں کا حوالہ پیش کر دیتے ہیں۔ یہ حوالے "العروۃ الوثقیٰ" کے مکتبہ اہلیہ بیروت والے ایڈیشن (۱۹۳۳ء) کے مطابق ہیں۔

مسلمانوں کے حکمرانوں کو غیروں سے امید باندھے ہمدردی رکھنے پر تنقید کرتے ہوئے ازراہ خیر خواہی لکھتے ہیں۔

"ایها الامراء العظام ما لکم وللأجانب عنکم (ها أنتم تحبونهم ولا یحبونکم) قد علمتم شأنهم ولم تبق ریبة فی أمرهم (إن تمسسکم حسنة تسؤهم وإن تصبکم سیئة یفرحوا بها) سا[illegible]هم إلی أبناء أوطانکم وأموال

دینکم وملتکم وأقبلوا علیهم ببعض ما تقبلون به علی غیرهم تجدوفیهم خیرعون وأفضل نصیر (آل عمران : ۱۱۹، ۱۲۰ کا اقتباس دیکھئے)

۲۔ اہل ایمان کو ابتلاء و آزمائش میں ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

إن امتحان اللّٰه للمؤمنین سنة من سننه یمیزبها الصادقین من المنافقین قرنا بعد قرن إلی أن تنقضی الدنیا فی کل قرن یدعو اللّٰه المؤمنین إلی قوم أولی باس شدید فان یطیعوا یوتهم اللّٰه اجر احسنا وإن یتولوا یعذبهم عذابا الیما۔

عبارت اور مضمون کے لیے سورۃ الفتح:۱۷ دیکھئے)

فمیزان عدل اللّٰه منصوب الی یوم القیامة وهنالك الجزاء الأوفی (ماخوذ از النجم : ٤١) فلا یحسبن الواسمون أنفسهم بسمة الأیمان القانعون منه برسم یلوح فی مخیلاتهم، إن عدل اللّٰه یترکهم وما یظنون کلا إنهم فی کل عام یفتنون

(ماخوذ از التوبہ:۱۲۶)

۳۔ علمائے اُمت کو ان کے فرائض سے آگاہ کرتے ہوئے صفحہ ۳۷، ۲۳۶ پر جو کچھ لکھا ہے وہ بھی ان کی قرآنی آیات کے اقتباسات پر قدرت کی ایک عمدہ مثال ہے۔

تاہم یہ سب کچھ عربی کے علم، مہارت اور ذوق کی باتیں ہیں اب تو ہم مسلمانوں کا رجحان دینی سے زیادہ مادی اور ذوق عربی سے زیادہ انگریزی ہوگیا

Marfat.com

ہے بقول اکبر الہ آبادی:

مسلمانوں کا وہ آئین طبع مستقل بدلا
چھٹی عربی، گیا قرآن، زبان بدلی تو دل بدلا

☆☆☆☆☆☆

Marfat.com

حفاظت متن قرآن

حَامداً و مصلّیاً و مستعیذًا۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعاً مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْم۔

قرآن عظیم کی عظمت کے کئی پہلو ہیں یوں تو ہر پہلو بذاتِ خود مظہر اعجاز ہے مگر اس معجزانہ عظمت کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جو نزول قرآن کے آغاز سے ظاہر ہونا شروع ہوا اور مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ بجائے دھندلا ہونے کے روشن تر ہوتا چلا گیا ہے۔ حتی کہ دشمن کی آنکھوں کے لئے ''چشمۂ آفتاب'' بن گیا۔ اور یہ ہے قرآن کریم کے متن کی حفاظت و صیانت کا پہلو۔ قرآن عظیم نے اپنے متعلق "لاریب فیه" ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ قرآن کریم کے نازل کرنے والے نے کئی وعدے بھی کئے اور اپنے وعدوں کے برحق ہونے کا دعویٰ بھی کیا۔ "انّ وعد اللّٰه حق" دُنیا نے قرآن عزیز کے کتنے ہی وعدوں کو پورا ہوتے دیکھا ہی۔ اور قرآن کا ہر وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ "لاریب فیه"

قرآن مجید کے دعووں اور وعدوں میں سے جس شان کے ساتھ اور جس حیرت انگیز طریقے پر وعدۂ جمع و حفاظت پورا ہوا ہے۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحفظون ... ان علینا جمعه و قرانه۔

یہ مقالہ انجمن خدام القرآن کی دوسری سالانہ کانفرنس کے موقعہ پر پڑھا گیا۔

Marfat.com

اس برہان قاطع نے اس کتاب عزیز کے دعویٰ "لایاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ۔ تنزیل من حکیم حمید۔ کی صداقت پر شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ ہر وہ آدمی جو کسی بات کی سچائی جان کر دیانت کے ساتھ اس سچائی کا اعتراف کر سکتا ہو، وہ اس کتاب عزیز کے صرف اسی پہلو کو دیکھ کر اسے اللہ کی کتاب اور اس کے لانے والے کو اللہ کا رسول (حق) تسلیم کر لے گا۔ لاریب فیہ۔

اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک بہت سے انبیاء علیہم السلام نے پہنچایا۔ مگر یہ پیام، یہ کتب ادیان سابقہ یا انہوں کے ہاتھوں محرف ہوئیں یا دشمنوں کے ہاتھوں کے ہاتھوں تلف ہوئیں۔ تعلیم و احکام کی برتری کا تقابل تو بعد کی بات ہے۔ تعلیم و احکام کی بنیاد یعنی اصل کتاب کے متن کی حفاظت کے بارے میں مسلمان اور صرف مسلمان کو ہی یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ ادیان عالم اور کتب سماویہ کے پیروکاروں کے مقابلے پر فخر سے سر بلند کر کے بات کر سکتا ہے۔

قرآن عظیم کی حفاظت کا وعدہ جس طرح پورا ہوا اور اس کے لئے جو اسباب و وسائل مہیا کئے گئے اس کا مختصر جائزہ پیش کرنے کی سعادت میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔

مگر ایک لمحہ رکئے۔ سوچئے کہ وعدہ حفاظت قرآن تو سچے پورا ہوا۔ اس وعدہ کی صداقت سے قرآن لانے والے کی صداقت ثابت ہوگئی۔ ہم ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہونے پر ایمان لے آئے۔ مگر خود اس وعدہ حفاظت کی کیا ضرورت تھی؟ کیا یہ صرف ایک دلیل صداقت نبوت ہے؟ یا جن انبیاء کی کتابیں محفوظ نہ رہیں ان کی صداقت پر حرف آ گیا؟ کلا!

یہ وعدہ حفاظت قرآن کریم دراصل اعلان ختم نبوت ہی تو تھا۔ اس اعلان کو قائم رکھا گیا ہے اس کا قائم رکھنا ضروری تھا۔ جب تک قرآن عزیز کی حفاظت

Marfat.com

چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ ختم نبوت کو چیلنج کرنا ضلالت ہی نہیں حماقت بھی ہے۔

قرآن حکیم کے اسنادی تعارف یا اس کے بارے میں بنیادی معلومات، (کہاں سے آیا؟ کس کو ملا؟ کہاں۔ کیسے اور کب ملا؟ وغیرہ) اس کے اجزائے ترکیبی (سورتوں) اور اس کی ہیئت مجموعی کی ترتیب و تدوین کا تعلق جزئی تفصیلات تک صحت و دیانت کے ساتھ محفوظ کرلی گئی ہیں۔ اور اس کی حفاظت کا حیرت انگیز انتظام پہلے دن سے آج تک معجزانہ تواتر کے ساتھ جاری ہے۔

قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک دم (جملہ واحدہ) نازل نہیں ہوا بلکہ نجما نجما تیئس سال تک نازل ہوتا رہا۔ بعض علماء نے اس زمانہ نزول کو بعض شواہد کی بنا پر ۱۷/ رمضان المبارک ۴۱ ولادت نبوی سے ۹ ذی الحجہ ۶۳ ولادت نبوی (یعنی ۱۰ھ) کے درمیان متعین کیا ہے۔ اس صورت میں نزول قرآن کی کل مدت ۲۲ سال ۲ ماہ ۲۲ دن بنتی ہے جس میں سے ۱۲ سال ۵ ماہ اور ۱۳ دن مکی دور و قبل ہجرت اور ۹ سال ۹ ماہ اور ۹ دن (یکم ربیع الاوّل ۵۴ ولادت نبوی تا ۹ ذی الحجہ ۶۳ ولادت نبوی) مدنی دور کے ہیں۔ قرآن کریم وحی الٰہی ہے۔ وحی کے لغوی و اصطلاحی معنی، اس کی مختلف صورتوں یا نزول وحی کے وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت وغیرہ کے بیان سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم صرف ان امور کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں جن کا تعلق براہ راست حفاظت متن قرآن سے ہے۔

نزول وحی کے لئے کوئی وقت، مقدار یا جگہ مقرر نہیں تھی۔ سفر و حضر دن یا رات میں جہاں اور جب حکم الٰہی ہوتا جبرئیل امین حاضر ہو کر کلام الٰہی پہنچا دیتے۔ جو کبھی چند آیات کبھی پوری سورت کبھی متعدد سورتوں کی متعدد آیات ہوتی تھیں۔ مختلف آئتیں اور سورتیں کسی واقعہ یا ضرورت کے مطابق نازل ہوتی رہتی

Marfat.com

تھیں۔اس واقعہ یا ضرورت کو ہی سبب نزول کہتے ہیں۔

متن قرآن کی آیتوں اور سورتوں میں تقسیم توقیفی ہے یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بتلائی ہوئی ہے۔ اور قرآن حکیم کی اصل بنیادی تقسیم یہی سور و آیات کی تقسیم ہے۔ اجزاء، ارباع، رکوعات، احزاب و منازل وغیرہ کی تقسیمات قراءت میں سہولت کے لئے بعد میں مقرر کی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی آیت کے حوالے کے لئے پارے اور رکوع وغیرہ کے حوالے کی بجائے سورہ اور آیات کا حوالہ دینا اہل علم میں مستعمل ہے۔ قرآن حکیم میں کل ۱۱۴ سورتیں ہیں۔ ہر ایک سورۃ کا نام بھی توقیفی ہے۔

قرآن مجید کی ترتیب نزول موجودہ ترتیب تلاوت سے مختلف تھی۔ موجودہ ترتیب تلاوت بھی توقیفی ہے یعنی خود حضورؐ کی مقرر کردہ ہے۔ ہر نئی وحی کے بعد آپ صحابہؓ کو بتا دیا کرتے تھے کہ ان آیات کو فلاں سورت کی فلاں آیت کے بعد پڑھنا ہے۔ نمازوں میں آیتیں اور سورتیں آپؐ کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق پڑھی جاتی تھیں، ہر سال رمضان کے مہینے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل کے ساتھ اس وقت تک کے نازل شدہ حصہ قرآن کا دور کرتے تھے۔ حیات طیبہ کے آخری رمضان میں یہ دور دو دفعہ کیا گیا اسے عرضہ اخیرہ کہتے ہیں (اس عرضہ میں زیدؓ بن ثابت بھی حضورؐ کے ساتھ رہے) اس طرح نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی ہی میں موجودہ ترتیب تلاوت عمل ہوئی تھی۔ روایات میں قرآن کریم کی ترتیب نزول کا ریکارڈ بھی موجود ہے اور تفسیر میں ہمیشہ اس ریکارڈ سے مدد لی جاتی رہی ہے۔ تاہم قرآن کریم کی ترتیب تلاوت عہد رسالت سے آج تک وہی چلی آتی ہے۔ سورتوں کی اندرونی ترتیب آیات بھی اور بالکل راجح ترتیب سور بھی۔

کسی بھی متن یا عبارت کی حفاظت کی ضمانت کی چار تدابیر ہوسکتی ہیں (۱) حفظ و یاد کر لینا) (۲) کتابت لکھ لینا (۳) محفوظ و مکتوب کی مسلسل قراءت و تلاوت اور (۴) کسی ایسی آفت کا انسداد جو کسی وقت میں سارے حافظوں اور ساری تحریروں کو فنا کر دے۔ قرآن کریم دنیا کی واحد کتاب ہے جس کی حفاظت کے لئے مقدم الذکر ہر سہ تدابیر ابتداء سے ہی اختیار کی گئیں۔ اس کے نتیجے میں چوتھی گارنٹی خود بخود حاصل ہوگئی ہے۔ نزول قرآن کی ابتداء سے آج تک غالبًا کوئی وقت، دن یا رات کم از کم عالم اسلام میں ایسا نہیں گذرا جس میں قرآن کریم کی کتابت، حفظ اور تلاوت کا کام جاری نہ رہا ہو۔

تلاوت کی بنیاد حفظ یا کتابت پر ہے۔ حفظ و کتابت قرآن پر عمل آغازِ نزول یا عہد نبوی سے شروع ہوا اور پھر یہ دونوں عمل آج تک جاری ہیں۔ لہذا ان دو امور کے بارے ذرا تفصیل سے بتانے کی ضرورت ہے۔

چونکہ نزولِ وحی کے ساتھ ہی سب سے پہلے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نازل شدہ حصہ قرآن کی تمام عبارت حفظ ہو جاتی تھی۔ اور بعد میں حضورؐ اس کی کتابت کا بندوبست فرماتے تھے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے حفظ قرآن کی بات سے آغاز کیا جائے۔ اور یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ دشمنانِ اسلام نے قرآن کریم کے بارے میں جو کچھ بھی گرد و غبار اُڑانے کی کوشش کی ہے اس میں تعصب اور ہٹ دھرمی اور نیت کی خرابی کے علاوہ اس حقیقت کا بھی دخل ہے کہ وہ لوگ حفاظت متن کے لئے حفظ و تلاوتِ متن کے متواتر و مسلسل عمل کی افادیت تو درکنار اس کے تصور سے بھی نا آشنا ہیں۔

حفظ و استظہار قرآن بعہد نبویؐ

ابھی بیان ہوچکا ہے کہ سورتوں اور آیتوں کا نزول ترتیب وار اور

بطریق تسلسل نہیں تھا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ ایک سورۃ ابھی مکمل نہ ہونے پائی کہ درمیان میں دوسری سورت نازل ہونی شروع ہو جاتی۔ (حضور کو بسم اللہ سے نئی سورت کے آغاز کا پتہ چل جاتا تھا) ..... بعض دفعہ ایک سے زیادہ سورتوں کی آیتیں بلا ترتیب ایک ہی وقت میں نازل ہوتی تھیں۔ سلسلہ وحی چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر عمر تک جاری رہا اس لئے آپ کی بتائی ہوئی ترتیب تلاوت کو ایک جلد کے اندر مسلسل کتاب کی صورت میں تحریر میں لانا ممکن نہ تھا۔ البتہ حافظے میں ترتیب کی یہ تقدیم و تاخیر بآسانی ضبط کی جاسکتی تھی۔ اس طرح حفظ قرآن سے صرف قرآن کے الفاظ و آیات ہی نہیں بلکہ ان الفاظ و آیات کی اندرونی ترتیب کی بھی حفاظت مقصود تھی۔

دواعی حفظ

مندرجہ ذیل امور نے شروع سے ہی مسلمانوں میں حفظ قرآن کریم کا بے پناہ شوق پیدا کر دیا تھا۔

۱۔ یہ اعتقاد کہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ کلام اللہ ہے۔ صحابہ کی نگاہیں ان متبرک کلمات کو حاصل کرنے کے لئے نزول وحی پر لگی رہتی تھیں۔ ہر ایک کے دل میں یہ آرزو بسی تھی کہ تازہ وحی کو سب سے پہلے میں ہی حاصل کروں۔

۲۔ قرآن مجید کی معجزانہ فصاحت و بلاغت اور عربوں کا اعلیٰ ادبی ذوق محض اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لئے کفار تک قرآن کریم سن کر محظوظ ہوتے تھے۔

۳۔ نمازوں میں قرآن مجید پڑھنے کی فرضیت کے باعث بھی ہر مسلمان کے لئے قرآن کریم کا کچھ نہ کچھ حصہ یاد کرنا ضروری تھا اگرچہ صحابہ نمازوں میں دیر تک قیام کرتے اور لمبی لمبی سورتیں پڑھتے تھے۔

Marfat.com

۴۔ صحابہ کرامؓ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول و فعل کے اتباع کا شوق۔ فرض نمازوں میں بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا الاعراف جیسی طویل سورتیں پڑھنا ثابت ہے۔ اور قیام الیل (تہجد) میں تو ایک ہی رکعت میں کئی سورتیں بھی پڑھی ہیں۔

۵۔ امامت نماز، تعلیم قرآن کریم اور بعض سرکاری عہدوں کے لئے قراء کی قدردانی اور ترجیح بھی حفظ قرآن کا محرک تھی۔

۶۔ قرآن کریم کا آہستہ آہستہ ۲۳ برس کے عرصہ دراز میں نازل ہونا بھی حفظ میں سہولت کا باعث تھا۔

۷۔ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مسلمانوں کو تعلیم و حفظ قرآن اور تلاوت پر مداومت کی ہمیشہ تلقین کرتے رہنا۔ کتب احادیث میں صرف قرآن کریم کے پڑھنے پڑھانے اور یاد کرنے کے متعلق اس قدر مواد موجود ہے کہ اس موضوع پر مستقل مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔

۸۔ ہر نئے مہاجر مدینے میں باہر سے آنے والے مسلمان کو آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن سیکھنے کے لئے کسی کے ذمے کر دیتے تھے۔

وکان یسمع لمسجد رسول اللّٰہ علیہ وسلم ضجة بتلاوة القرآن حتی امرهم رسول اللّٰہ (ص) ان یخفضوا اصواتهم لئلا یتغالطوا (عبادة الصامت)

۹۔ اکثر صحابہ اپنے گھروں میں بچوں اور عورتوں کو قرآن پڑھاتے تھے۔ رات کو مسلمانوں کے گھروں میں تلاوتِ قرآن کی دلفریب گونج سنائی دیتی تھی۔

یسمع فیها دویا کدوی النحل بالقرآن ......ایک دفعہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں اپنے اشعری ساتھیوں کے مکان رات کو ان کی قرآن خوانی کی آواز

Marfat.com

سے پہچان جاتا ہوں اگرچہ دن کو دیکھے نہیں ہوتے۔

ان سب امور کا نتیجہ تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بیشمار لوگ پورا قرآن حفظ کر چکے تھے۔ ان میں سے بعض ہر رات میں قرآن ختم کرتے تھے۔ اس حد سے بڑھے ہوئے شوق تلاوت کے پیش نظر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پانچ دن یا تین دن سے کم عرصے میں قرآن ختم کرنے سے منع کرنا پڑا۔

کتب حدیث و قراءت میں صرف ان قراء صحابہ کے نام دیئے جاتے ہیں جن سے سند حضور تک پہنچی اور جنہوں نے حضور کو خود پورا قرآن سامنے ختم کیا اور سنایا۔ ورنہ خود صحابہ سے حفظ کرنے والے صحابہ تو شمار بھی نہیں ہو سکتے۔ بعض بڑے اہم قراء صحابہ بذات خود ایک طرح کے مدرسہ حفظ القرآن تھے۔ (تفصیلات اسماء محمد ترک صحی ص ۲۸)

(صرف بیر معونہ یمامہ کے شہداء قراء کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب بیان کی گئی ہے) عہد نبوی سے آج تک مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کی بنیاد حفظ قرآن پر رکھی جاتی رہی ہے۔

کتابت قرآن بعہد نبوی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء ہی سے اس بات کا اہتمام کیا کہ کلام الٰہی کو خود اپنے کلام اور عام بات چیت سے (کہ وہ بھی عربی ہی میں تھی) الگ محفوظ اور ممتاز کر دیا جائے۔ اس کے لئے آپ نزول وحی کے بعد کسی پڑھے لکھے مسلمان سے نازل شدہ کلام لکھوا لیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں عرب میں کاغذ کا رواج بہت کم تھا۔ (فتح مصر کے بعد اس کا رواج و استعمال زیادہ ہوا) ---اس کے لئے کھجور کے پتوں کے (عسب) شانے کی ہڈی (اکتاف) پتھر کی چھوٹی سلیٹ (اللخاف) لکڑی کے تختے (اقتاب) اور چمڑے کے

Marfat.com

ٹکڑے (ادیم) یا ہرن کی جھلی (رق) وغیرہ اشیاء استعمال ہوتی تھیں۔ جو چیز بھی دستیاب ہوتی اس پر ہی نازل شدہ آیات لکھ لی جاتی تھیں۔ پھر آپ اس تحریر کو مسلمانوں میں پھیلاتے۔ وہ اس سے نقل کرکے اپنے پاس رکھتے ابتدائی دور میں ہی مکہ مکرمہ میں مسلمان گھروں میں قرآن کریم کے مکتوب حصے موجود تھے۔ حضرت عمر کا واقعہ اسلام اس کا ایک واضح ثبوت ہے۔ کاتبانِ وحی کی تعداد ۴۰ بلکہ ۴۳ تک بیان کی گئی ہے۔ بعض کتابوں کے مستقل ابواب اور بعض رسائل و رسالہ کتاب النبیؐ موجود ہیں۔ خیال رہے کہ کاتب وحی سے مراد وہ شخص ہے جس سے نئی وحی کی پہلی کتابت کا کام لیا گیا ہو ورنہ اپنے طور پر تو بیشمار صحابہ اپنے اور دوسرے کے قرآن نقل کرتے رہتے تھے۔

قرآن کریم کی کتابت کے ذریعے تعلیم دراصل آنحضورؐ کی تعلیمی سیاست کا ایک نہایت اہم پہلو تھا۔ مدینہ میں آنحضورؐ نے صرف قرآن کریم کی قراءت و کتابت کی تعلیم کے لئے مسجد نبوی کو ایک طرح کی اقامتی درسگاہ بنا دیا تھا۔ عبداللہ بن سعید بن العاص جو ایک خوشخط کاتب تھے اور عبادہ بن الصامت کو اصحاب صفہ کو قرآن لکھنا پڑھنا سکھانے پر مامور کیا گیا تھا۔ صفح کے صرف مقیم طلبہ کی تعداد تراسی تک بیان کی جاتی ہے۔ سعد بن عبادہ انصاریؓ بعض دفعہ ایک رات میں اسی (۸۰) تک اہل صفہ کی ضیافت کرتے تھے۔ ۴۰۰ تک کی تعداد کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مدینہ منورہ میں کسی صحابی کے گھر میں ایک مدرسہ کے وجود کا پتہ بھی چلتا ہے (حمید اللہ بحوالہ الکتانی) بدر کے قیدیوں سے فدیہ میں بچوں کو تعلیم دلوانے کا واقعہ تو مشہور ہے جسے تعلیم قرآن کے لئے استعمال کرنا ہی مقصود تھا۔ آنحضورؐ نے اپنے متعلق ''بعثت معلماً'' فرمایا۔ بچوں کو حکم دیتے تھے کہ اپنے پڑوسیوں سے علم سیکھیں اور اپنے پڑوس کی مسجد میں سبق پڑھا کریں۔ عہد نبوی

Marfat.com

میں مدینہ منورہ میں ۹ مسجدیں تھیں۔ پانچوں وقت کی نماز وہاں ہوتی مسجد نبوی میں ہوتا تھا۔ حکومت کے وسیع پیمانے پر قائم ہو جانے کے بعد آنحضورؐ نے جہاں بھی عامل بھیجے ان کے ذمے مدارس کی نگرانی اور تعلیم کی دیکھ بھال کا کام بھی ہوتا تھا۔ حضورؐ نے ''علم سیکھو اور سکھاؤ'' کی ایک لگن پیدا کر دی تھی۔ لکھنا پڑھنا سیکھنے کی ابتداء یا کم از کم معیار قرآن کریم کا لکھنا پڑھنا سیکھنا تھا۔ بعض خواتین کا قرآن کریم کی کتابت و قراءت سیکھنا بھی مذکور ہے۔ مسجد نبوی یا بیت رسول اللہ میں مکتوب مواد قرآن کا تعلیم و کتابت کے لئے رکھے جانا بھی ثابت ہے۔ ان سب اقدامات کا نتیجہ تھا کہ عہد نبوی تک پورا قرآن کریم محفوظ و مکتوب صورت میں موجود تھا۔ محفوظ ترتیب تلاوت کے ساتھ حفاظ کے سینوں میں۔ اور مکتوب بیشتر یا متعدد صحائف میں (صحیفہ، صحائف، مصحف) متعدد صحابہ کے پاس پورے قرآن یا اس کا کچھ حصہ تحریری مواد کی صورت میں موجود تھا۔ اس تحریری مواد کے ایک جزء (بلحاظ مواد کتابت یا بلحاظ ترتیب سورۃ) کو صحیفہ (جمع صحف) کہا جاتا تھا۔

عہد نبویؐ میں حفاظت متن قرآن کے اس انتظام کی اہمیت اور آنے والے دور ''تدوین قرآن'' میں اس کی افادیت کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے پہلے حصہ مضمون میں بیان کردہ اُمور کا خلاصہ کلام ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ بالخصوص حسب ذیل بنیادی حقائق پیش نظر رہیں۔ (۱)

۱۔ قرآن کریم ایک دم نہیں بلکہ آہستہ آہستہ ۲۲، ۲۳ سال کے عرصے میں نازل ہوا۔

۲۔ قرآن کریم کی حفظ و کتابت کا سلسلہ آغاز نزول سے ہی شروع ہو گیا تھا اور آخر تک جاری رہا۔

Marfat.com

۳۔ قرآن کریم کی ترتیب نزول موجودہ ترتیب تلاوت سے مختلف تھی۔

۴۔ موجودہ ترتیب تلاوت توقیفی ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بتائی ہوئی اور مقرر کردہ ہے، اور آپؐ نے یہ کام مشورہ و اجتہاد سے نہیں بلکہ وحی الٰہی کے زیر ہدایت کیا۔

۵۔ قرآن کریم کی آیتوں کی تعیین، سورتوں کی تقسیم اور تسمیہ کا کام آنحضورؐ کے ارشاد کے مطابق ہوا۔ اور یہ تمام ترتیب و تقسیم تلاوت و حفظ قرآن کے ذریعے مسلسل متعین و شائع کی جاتی رہی۔ قوت حافظہ سے کام لینا عربوں کی عادات اور قومی خصوصیات کا بہترین استعمال تھا۔

۶۔ ہر رمضان میں آنحضرتؐ جبریل امین کے ساتھ اس وقت تک کے نازل شدہ قرآن کا دور کیا کرتے تھے۔ یہ دور ترتیب تلاوت کے مطابق ہوتا تھا۔ صحابہ کرام بھی رمضان میں خصوصاً بکثرت تلاوت کیا کرتے تھے اور حفاظ آپس میں دور کرتے تھے۔ اُس وقت سے لے کر آج تک عالم اسلام میں حفاظ کا حفظ قرآن کے لیے باہم دور کرنا رائج چلا آتا ہے۔(۲) (دور کے لیے عربی لفظ عرضہ ہے۔ اپنی زندگی کے آخری برس میں آنحضرتؐ نے جبریل کے ساتھ یہ دور دو دفعہ کیا تھا۔ (اسے اصطلاحاً عرضہ اخیرہ کہتے ہیں اور یہ اصطلاح آئندہ مضمون میں استعمال ہوگی) بلکہ اسی دو دفعہ کے دور سے آنحضورؐ نے اسے اپنی حیات طیبہ کا آخری رمضان سمجھ لیا تھا۔

۷۔ حفاظ کے سینوں میں تو قرآن ایک مسلسل و مرتب کتاب کی شکل میں جمع ہو رہا تھا۔ لیکن آنحضورؐ کی زندگی میں پورا قرآن کریم ایک مسلسل و مرتب کتاب کی شکل میں لکھے جانے میں بعض دیگر امور (امکان نسخ، جدید وحی) کے علاوہ سب سے بڑا مانع ترتیب نزول اور ترتیب تلاوت کا اختلاف تھا۔

Marfat.com

حضور کی وفات کے ساتھ یہ سب موانع ختم ہوئے۔ تب ہی قرآن کو کتابی
صورت میں یکجا کرنے کا وقت آیا۔

۸۔ ترتیب نزول اور ترتیب تلاوت کے اختلاف کی اس بڑی مشکل پر حفظ و نشر
کتابت کے ذریعے ایسے طریقے پر قابو پالیا گیا کہ نہ صرف ہر مسلمان کو
ترتیب تلاوت سے اچھی طرح آگاہ کر دیا گیا بلکہ اہل علم کے لیے ترتیب
نزول کا ایک ریکارڈ بھی محفوظ ہو گیا۔ جس کی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

۹۔ آنحضرتؐ کی وفات سے مناسب عرصہ (کم از کم چند ہفتے) پہلے نزول
قرآن کا سلسلہ ختم ہوگیا یوں بلحاظ نزول آخری آیات کے بھی بذریعہ حفظ و
کتابت مسلمانوں میں شائع ہو جانے میں کوئی شبہ باقی نہ رہا۔

۱۰۔ کتابت قرآن کریم کے لیے عرب کے حالات (سامان کتابت کی کم یابی
اور تعلیم کی کمی وغیرہ) کے مطابق بہترین طریقہ اختیار کیا گیا کہ جو جزو
قرآن (آیات یا سورۃ) نیا آئے۔ جس طرح کے سامان کتابت پر ممکن ہو
لکھ کر یا لکھوا کر پاس رکھ لو۔ دیکھ کر تلاوت کرتے رہو اور بتائی ہوئی
ترتیب کے مطابق یاد کرتے جاؤ۔ اس طرح ہر شخص اپنے پاس موجود
(تحریری مواد کو حافظے والی ترتیب تلاوت کے عین مطابق نہ سہی لیکن اس
کے قریب تر صورت میں مرتب کرکے رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ان مختلف
حصوں کو ہی پرو کر یا باندھ کر جو ایک چھوٹا مجموعہ بنالیا جاتا تھا اسے صحیفہ کہا
جاتا تھا۔

۱۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذاتی عمل اور مثال کے علاوہ بعض دیگر
اسباب نے تلاوت و کتابت قرآن کی جو بے پناہ تڑپ اور لگن پیدا کر دی
تھی۔ اس کے نتیجے میں آنحضرتؐ کی وفات تک قرآن مجید کی موجودہ مکمل

اور آخری صورت میں بھی ''پورے ختم'' ---حفظ و ناظرہ --- ہزاروں نہیں تو سینکڑوں ضرور ہو چکے تھے، اور مسلمانوں کا کوئی گھر قرآن کریم کے جزوی صحیفوں (کم از کم بعض اجزاء و سور) سے خالی نہیں تھا۔

۱۲۔ عہد نبویؐ میں جن صحابہؓ نے پورا قرآن کریم حفظ کیااور ساتھ ہی قرآن کریم کا غیر مرتب مگر مکمل تحریری مواد بھی جمع کر لیا تھا (جسے اب حافظے کی مدد سے تحریری طور پر ترتیب دے لینا اُن کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس میں کسی انفرادی سہو و نسیان کا امکان ہو سکتا تھا۔) ایسے بزرگوں کی فہرست بھی اتنی طویل ہے۔ (تحریری مواد رکھے بغیر محض حافظے میں محفوظ کرنے والے حفاظ کی تعداد تو بہت زیادہ تھی) کہ اگر عہد نبویؐ میں حفاظت متن قرآن کی اور کوئی اقدامات نہ بھی کئے جاتے تو صرف اتنے مقدس نفوس بھی اُس صحت و حفاظت کی کافی ضمانت سمجھے جاسکتے تھے۔

۱۳۔ نزول قرآن کے زمانہ تک عربی کتابت اگرچہ نری ابتدائی مرحلے میں نہیں تھی۔ تاہم ابھی تک اس میں شکل (حرکات) تو کجا اعجام (ملتے جلتے حروف کو نقطے لگا کر باہم متمیز کرنا) کا رواج بھی نہ تھا) اس مشکل پر قابو پانے کے لیے شروع سے ہی تعلیم قرآن کو تلقی و سماع کا پابند کر دیا گیا تھا، یعنی اُستاد سے لفظ سننا اور پھر اُس کے سامنے دُہرانا۔ تحریر میں بھی محض حافظے کی بنا پر یا سن کر لکھ لینے کی بجائے دوسری مستند تحریر سے نقل کرنے کا رواج ڈالا گیا ..... تلفظ مستند آدمی کے منہ سے سیکھنا اور تحریر مستند تحریر سے بعینہ نقل کرنا یہ وہ دو سنہری اصول ہیں جن کی بنیاد عہد نبوی میں رکھی گئی اور آج تک قران کریم کے متن (تلفظ ہو یا تحریر) کی قطعی حفاظت کے لیے ان ہی پر عمل کیا جاتا ہے۔(۳)

۱۴۔ قرآن کریم کے بعض کلمات کی مختلف قراءتوں کا آغاز بھی آنحضرتؐ کے زمانے سے اور خود حضورؐ کے اذن و اجازت سے ہوا۔ ان مختلف قراءتوں کو ''سبعہ احرف'' کے تحت وحی الٰہی ہونے کی سند حاصل تھی۔ اس میں بنیادی شرط آنحضورؐ سے تلقی و سماع کی تھی۔ یہ روایت بالمعنی کی اجازت ہرگز نہیں تھی بلکہ اصل نص (عبارت یا کلمات) کا مستند تنوع تھا۔ قراءت کے اس تنوع میں اہل زبان و اہل علم کے لئے لغوی و ادبی افادیت بھی۔ حسن و جمال کا ایک پہلو بھی تھا۔ لیکن آگے چل کر بعض وجوہ کی بنا پر یہی چیز ایک فتنہ کا باعث بننے لگی۔ تو اس تنوع قراءت (ثابت بالسنت) کو ایک مخصوص علم کا درجہ دے دیا گیا اور عوام کے لیے اس کا دروازہ بند کرنا ضروری ہوگیا۔ اس کی تفصیل ''جمع قرآن بعہد عثمان'' میں آئے گی۔ یہاں بطور تعارف ''سبعہ احرف'' کے اس پہلو کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے۔ کہ بہر حال اس کا آغاز عہد نبویؐ سے اور اذن نبویؐ سے ہوا اور حفاظت قرآن کو بجا طور پر ''حیرت انگیز'' بنانے میں اس تنوع قراءت کا بھی ایک خاص حصہ ہے۔ (۴)

۱۵۔ آنحضورؐ جو نئی وحی کو اپنے سامنے کی کاتب سے لکھوا لیا کرتے تھے۔ لکھوانے کے بعد اس سے سن بھی لیتے اور کوئی غلطی ہوتی تو فوراً درست کرا دیتے۔ نئی وحی کی کتابت کا کام متعدد لوگوں نے کیا۔ کسی کے کم اور بعض کو زیادہ موقع ملا۔ ایسے لوگوں میں سے ایک صحابی زید بن ثابتؓ بھی تھے۔ حضورؐ کے سامنے لکھی ہوئی اور آپؐ کی خود املاء کرائی ہوئی یہ تحریریں قرآن کے آئندہ تحریری مجموعوں کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی تھیں۔ قرآن کریم کے تلفظ (قراءت) میں تلقی و سماع کی سند اور قرآن کریم کی تحریر

میں نقل کی سند کا آنحضورؐ تک پہنچنا ضروری تھا۔ اور تحریر و تلفظ میں مطابقت صحت و حفاظت کا معیار بھی تھا اور ثبوت بھی۔

یوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات تک حفظ و کتابت قرآن کا کام مندرجہ بالا اُصولوں کی روشنی میں ہوتا رہا۔ آج تک قرآن کریم کی تعلیم (حفظ یا ناظرہ) اور کتابت میں انہی اُصولوں کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔

۱۶۔ دُنیا کی کسی بھی مذہبی (آسمانی) کتاب کے ماننے والے (بعد کے اتلاف یا تحریف کی بحث سے قطع نظر) اس بات کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتے کہ اُن کی کتاب لانے والے کی زندگی میں اُس کتاب کی حفاظت کا کوئی بندوبست ہوا بھی تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوا کہ شروع میں کچھ لوگوں نے اپنے ہادی کی کچھ باتیں زبانی یاد رکھیں جو بہت بعد میں جا کر کتابی شکل میں لکھی گئیں۔ بعض کتابوں کا زمانہ تدوین ایک ہزار برس کے لگ بھگ بھی گنا گیا ہے۔ پھر ان کتابوں کو کئی دفعہ صفحہ ہستی سے یکسر نابود کر دینے والی آفات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ آغاز کار ہی سے حفاظت متن کا یہ ہمہ گیر انتظام صرف قرآن کریم کو میسر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''زن کوز پشت'' کی ذہنیت رکھنے والے چند ایک معاندین کو چھوڑ کر بہت سے نسبتاً حق پسند غیر مسلموں نے بھی قرآن کریم کی اس غیر معمولی حفاظت کا اعتراف کیا ہے۔ (۵)

۱۷۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے ساتھ سلسلہ وحی بند ہو جانے کے باعث قرآن کریم کے متن میں کسی تبدیلی یا اضافہ کا امکان ختم ہوگیا۔ اب قرآن مکمل ہو چکا تھا۔ اس کی اپنی آخری مکمل اور متعین و مرتب صورت میں "جمع فی الصدور" (بذریعہ لفظ) کا کام بھی مکمل ہوگیا۔ اس کی

Marfat.com

آخری آیت تک کے تحریر میں آجانے سے "جمع فی الصدور" (بذریعہ کتابت) کا کام بھی منتشر اوراق (مواد کتابت) کی صورت میں تکمیل پذیر ہوچکا تھا۔ اب اسی "فی السطور" (تحریری) مجموعے کو "فی الصدور" (حفظ کردہ) مجموعے کے مطابق مرتب و مدون کرلینے کا صحیح وقت آگیا تھا۔ اس سے پہلے یہ کام ممکن نہ تھا ... اور اب اس میں تاخیر درست نہ تھی۔

۱۸۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حفاظت متن قرآن کے دو بنیادی اصول طے پاگئے اور عملاً نافذ کر دیے گئے (الف) حفظ جس کے ذریعے تلفظ (Pronunciation) اور ترتیب کی حفاظت مقصود تھی اور (ب) کتابت — جس کے ذریعے ہجا (Spelling) اور رسم (Orthography) سے استناد و نص پر اعتماد کی بنیاد قائم کی گئی۔ عہد نبوی کے بعد سے آج تک حفاظت متن قرآن کے لیے انہی دو اصولوں سے کام لیا گیا ہے۔ البتہ مختلف زمانوں میں عصری ضروریات اور حالات کی بنا پر ان اصولوں کے عملی اطلاق میں وسعت اور افادیت کو ملحوظ رکھا جاتا رہا ... ان بنیادی اصولوں کی روشنی میں عہد نبوی کے بعد سے عصر حاضر تک حفاظت متن قرآن کے لیے جو اقدامات کیے گئے ان کو ہم چار مراحل کے تحت بیان کرسکتے ہیں۔

۱) عہد صدیقی

۲) عہد عثمانی

۳) اموی اور عباسی دور

۴) طباعت اور صدا بندی کا دور (یعنی عصر حاضر)۔

عہد صدیقی — ایک خطرے کے امکان بعید کا احساس اور [illegible]

Marfat.com

وقت تدارک۔

۱۹۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے اندر قرآن کریم کی عظمت اور اہمیت کا جو احساس، اُس کے فہم و تدبر کا جو شوق و ذوق اور اس کی تلاوت اور تعلیم کا جو بے پناہ شغف پیدا کر دیا تھا، اُس کا منطقی نتیجہ تھا کہ آنحضورؐ کی وفات کے ساتھ ہی بیک وقت متعدد صحابہؓ کو ''جمع و تدون قرآن'' کا خیال از خود پیدا ہوا۔ بعض ممتاز صحابہؓ نے (جو پورا قرآن حفظ بھی کر چکے تھے اور جن کے پاس مختلف منتشر مواد پر مکمل قرآن تحریری طور پر بھی جمع ہوگیا تھا).....اپنے طور پر اس اصل تحریری مواد کو یا حسب ضرورت اُس کی نقل کو (مثلاً پتھر کی تختی سے جھلی یا کاغذ پر منتقل کر لینا تاکہ یکجا ترتیب دے کر رکھنا آسان ہو) اپنے حافظے کی مدد سے ترتیب تلاوت کے مطابق پورے قرآن کو یکجا مرتب کتاب (مصحف) یا کم از کم فائل (صحف یا صحائف) کی صورت میں مدون کرنا شروع کر دیا۔ ایسے بزرگوں میں سے عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

کیونکہ آگے چل کر خاص وجوہ کی بنا پر (جس کی تفصیل اسی مضمون میں بیان ہوگی) ان کے ''نسخوں'' کا ذکر حفاظت متن قرآن کی تاریخ کا ایک اہم موضوع بن گیا۔ ان کے علاوہ اس ضمن میں حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے نام بھی مشہور ہیں۔

۲۰۔ ان بزرگوں کی مساعی ''تدوین قرآن'' کی حیثیت انفرادی تھی۔ اور اُن کے کام میں انفرادی رجحانات و ضروریات اور انفرادی معلومات کا عکس نمایاں

تھا۔ بعض نے ذاتی انتفاع اور یادداشت کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کردہ بعض تفسیری اشارات بھی اپنے مصاحف میں لکھ لیے تھے۔ مثلاً حضرت علیؓ کے جمع کردہ نسخے کا ذکر جس طرح شیعہ سنی روایت میں آتا ہے، اس میں قدر مشترک یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ نسخہ غالباً ''تدوین متن قرآن'' سے زیادہ ''تدوین تفسیر قرآن'' کی سب سے پہلی کوشش تھی۔ اسی طرح بعض صحابہؓ کے مصاحف میں ''سبعہ احرف'' پر مبنی کچھ اختلافات قراءات بھی تھے، جن کا اظہار بعض دفعہ تلفظ کے تنوع اور بعض دفعہ رسم کے اختلاف کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔ انفرادی عمل میں غلط فہمی یا سہو و نسیان کے امکانات بھی اسی نوعیت کے اجتماعی کام کی نسبت یقیناً زیادہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ آگے چل کر یہ بھی منکشف ہوا کہ بعض نامی گرامی صحابہؓ کے ذاتی تیار کردہ نسخے اجتماعی اصلاح کے محتاج تھے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی کتاب کی حفاظت مقصود تھی۔ اس نے وفات نبویؐ کے بعد ایک سال کے اندر پورے قرآن کریم کو مکتوب صورت میں یکجا مدون اور مرتب کرنے کی ایک اجتماعی کوشش کے اسباب و محرکات بھی پیدا کر دیے۔

۲۱۔ یمامہ (نجد و بحرین کا درمیانی علاقہ) کے مسیلمہ کذاب نے آنحضورؐ کی زندگی ہی میں ۱۰ھ میں نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ آنحضورؐ کی وفات (ربیع الاول ۱۱ہجری) کے بعد ابوبکر صدیقؓ نے مسیلمہ اور دیگر مرتدین عرب کی بغاوتوں کو کم و بیش دو سال کے اندر فرو کیا۔ مسیلمہ کے ساتھ مسلمانوں کی شدید جنگ کو جنگ یمامہ کہا جاتا ہے جو ربیع الاول ۱۲ھ میں ہوئی۔ اس جنگ میں مسیلمہ مارا گیا۔ مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ تاہم ان کے جانی نقصانات اتنے زیادہ (ایک ہزار سے زائد) تھے [illegible]

Marfat.com

تک جتنی جنگیں لڑی گئیں۔ ان میں اس کی نظیر کم ملتی تھی۔ شہدائے یمامہ میں بہت سے لوگ پورے قرآن کی حافظ تھے (قراء) تھے۔ جن میں سب سے مشہور سالم بن معقل (مولی ابی حذیفہ) تھے اور جزوی حفاظ کی تعداد اُن سے کہیں زیادہ تھی۔ ہرچند کہ جنگ یمامہ کے بعد بھی زندہ موجود صحابہؓ میں ایسے بزرگ قراء کی تعداد..... جو حفظ و کتابت قرآن کریم کے لحاظ سے درجہ اول میں شمار ہوتے تھے..... یمامہ کے شہید قراء کے مقابلے پر کہیں زیادہ تھی اور یمامہ کی جنگ سے حفاظت متن قرآن کو کوئی فوری اور شدید خطرہ لاحق نہیں ہوگیا تھا۔ تاہم مسلمان اس وقت سخت ہنگامی حالات اور شدید خطرات سے دو چار تھے۔ یمامہ سے کہیں بڑی جنگوں کے امکانات موجود تھے۔ پھر مسلمانوں کے اندر دین کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دینے کا جو جذبہ اس وقت موجود تھا۔ (بقول حضرت عمرؓ وہ میدان جنگ میں پروانہ وار گرتے تھے)..... اس کے نتیجے میں قراء کی اکثریت کے معدوم ہو جانے کے امکانات کو مطلقاً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت تک قراء (مکمل حافظوں) کی تعداد بہرحال محدود تھی۔ قرآن کریم کے آخری حصوں کے نزول کو چند ہفتے یا چند مہینے ہی ہوئے تھے۔ عرب کے کونے کونے میں مکمل حفاظ موجود نہ تھے۔ اتنی جلدی ایسا ہونا ممکن بھی نہ تھا۔ ایسے (مکمل) حفاظ کی زیادہ تعداد مدینہ منورہ ہی میں تھی۔ اور مدینہ کو مرتدین کے ہاتھوں خطرہ میں پاکر یہ لوگ جاں بکف ہو کر میدان میں نکل آئے تھے۔ اس کے ساتھ اگر یہ بات بھی پیش نظر رکھی جائے کہ قرآن کریم کی ترتیب تلاوت بڑی حد تک ابھی صرف حافظے کے ذریعے متعین اور محفوظ تھی۔ کتابت یا تحریر ابھی تک نص قرآنی (متن) کی ترتیب سے

زیادہ اس کی حفاظت اور اشاعت کے لیے استعمال کی جاتی رہی تھی۔ شروع سے بنیادی اہمیت حفظ و استظہار کو دی گئی تھی نہ کہ مصاحف و کتابت کو۔ اگرچہ موخر الذکر کو نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے حفاظ کی اکثریت کے معدوم ہو جانے کے امکان کے ساتھ متن قرآن کے ضیاع کا امکان نہ سہی متن کی ترتیب کے ضیاع کا امکان ضرور وابستہ قرار دیا جا سکتا تھا۔ یہی تھا وہ دور اندیشانہ انداز فکر جس کی بنا پر واقعہ یمامہ کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ صدیق کو ''جمع متن قرآن'' کا کام کر ڈالنے کا مشورہ دیا۔ حضرت عمرؓ کی سکیم کا مقصد ایک تو مدون متن کی ایسی حفاظت کا بندوبست کرنا تھا، جس کی طرف بوقت ضرورت رجوع کیا جا سکے۔ دوسرے قرآن کریم کی آخری اور مکمل شکل کی توثیق ''بذریعہ حافظہ'' کے ساتھ ساتھ ''بذریعہ کتابت'' بھی مطلوب تھی۔

۲۲۔ حضرت ابوبکرؓ پہلے تو متردد ہوئے جس کی بڑی وجہ تو ''خوفِ بدعت'' تھا۔ لیکن غالباً اس تردد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کہیں ''کتابتِ قرآن'' پر انحصار ''حفظِ قرآن'' کے بارے میں تساہل اور تغافل کا باعث نہ بن جائے عربوں کے نزدیک تحریری یادداشت حافظے کی کمزوری کی علامت بھی تھی اور سبب بھی ... بہرحال جب ابوبکر صدیقؓ پر حضرت عمرؓ کے مشورے کی افادیت واضح ہوئی تو انہوں نے اس کام کے لیے حضرت زید بن ثابت انصاریؓ کو منتخب کیا۔ ابوبکر صدیقؓ خود حافظِ قرآن تھے اور وہ خود بھی یہ کام کر سکتے تھے مگر ایک شدید بحرانی دور کے سربراہ مملکت ہونے کی حیثیت سے آپ دراں حالات اس کام پر پوری توجہ نہیں دے سکتے تھے اور یہ کام جز وقتی نہیں بلکہ ایک ہمہ وقتی انہماک سے کرنے کا تھا۔

۲۳۔ زید بن ثابتؓ کا انتخاب اُن کی اس کام کے لیے کئی لحاظ سے مسلمہ اہلیت کی بنا پر کیا گیا تھا۔ ان میں سے بیشتر اُمور کا ذکر خود حضرت ابوبکرؓ صدیق نے زیدؓ کے تقرر کے وقت کر دیا تھا۔ اس کے لیے حضرت زیدؓ کے حسب ذیل خصائص کو ذہن میں رکھنا چاہئے۔ (ا) وہ نوجوان تھے۔ اس وقت اُن کی عمر ۲۲ سال تھی۔ پورے قرآن کریم کی کتابت یوں بھی کچھ کم محنت طلب نہیں ہے۔ لیکن متفرق تحریری مواد کو متعدد حفاظ کی مدد سے ایک مقررہ طریق کار اور شرائط (جن کا ذکر ابھی آگے آتا ہے) کے ساتھ مدون کرکے لکھنا احتیاط کے علاوہ بڑی محنت اور کاوش کا کام تھا۔ اور ایسے کام کے لیے ''نوجوان'' ہونا بڑی موزوں اور بنیادی ضروری صفت تھی۔ خود حضرت زیدؓ نے اس کام کو پہاڑ اُٹھانے سے زیادہ سخت قرار دیا تھا۔ اور اس کی وجہ متقیانہ ورع و احتیاط کے علاوہ وہ ذہنی و جسمانی مشقت اور وقت و آرام کی قربانی بھی تھی، جو اس کام میں درکار(٦) تھی۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ حضرت زیدؓ نے یہ عظیم کام ایک سال کے عرصے میں ..... جنگ یمامہ اور وفات ابی بکرؓ صدیق کے درمیان..... سر انجام دیا تھا۔

(ب) وہ ذہین اور عقل مند تھے۔ اُن کی عربی کتابت میں مہارت کے سب معاصرین معترف تھے(۷)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر انہوں نے دو تین ہفتوں میں عبرانی زبان کا لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ عبداللہ بن عباسؓ اپنی ساری علمی و خاندانی عظمت کے باوجود اُن کے مکان پر بعض مسائل پوچھنے جایا کرتے تھے۔ (ج) وہ امانت اور استقامت میں شک و شبہ سے بالاتر تھے۔ علمی فضیلت اس پر مستزاد تھی۔ حضرت عمرؓ نے اُنہیں تین دفعہ مدینہ میں اپنا قائم مقام

بنایا۔ حضرت عثمانؓ جب بھی حج پر جاتے انہیں مدینہ میں قائم مقام بنا کر جاتے
تھے۔ حضرت زیدؓ کی اس صفت دیانت وتقویٰ کے ذکر (بالفاظ ابی بکر صدیقؓ
"لانتھمک" سے دیگر کبار صحابہؓ کی دیانت مشکوک نہیں ہو جاتی (بعض کو یہ بھی
سوجھی ہے)..... بات صرف اتنی ہے کہ اس کام کے لیے جسمانی قوت برداشت
اور ذہانت کے ساتھ دیانت اور استقامت بھی درکار تھی۔ دیگر بہت سے بزرگ
بھی ان صفات میں حضرت زیدؓ کے برابر یا ممکن ہے کسی درجے میں ان سے
بڑھ کر ہوں۔ تاہم حضرت زیدؓ میں یہ جملہ بنیادی صفات ضرور موجود تھیں۔ (۸)
حضرت زیدؓ کاتب وحی بھی رہ چکے تھے۔ قرآن کریم کے بعض حصے انہیں سب
سے پہلے آنحضورؐ کے سامنے خود تحریر کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس کے علاوہ وہ آنحضورؐ
کے زمانے میں مختلف مواد کتابت (رقاع۔ چھوٹے ٹکڑوں) سے قرآنی آیات
کے نسبتاً بڑے مجموعے بھی تیار کیا کرتے تھے۔ یہ ان صحابہ کرامؓ میں سے ایک
تھے جنہوں نے آنحضورؐ کی زندگی میں متفرق مواد پر مکمل قرآن تحریری صورت میں
بھی اور بذریعہ حفظ بھی جمع کر لیا تھا۔

(۹) حضرت زیدؓ کی سب سے بڑی اور بے مثل خصوصیت یہ تھی کہ وہ
"عرضۂ اخیرہ" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شامل رہے تھے۔
اس خصوصیت میں وہ واقعتاً تمام صحابہؓ میں ممتاز تھے اور اس کام کے لیے یہ امتیاز
کچھ کم اہم نہیں تھا۔ (۱) (دیکھئے اس مضمون کا پیرا نمبر ۲)

۲۴۔ ان تمام صفات، اہلیت اور خصوصیات کے باوجود حضرت ابوبکر صدیقؓ نے
جمع قرآن کے لیے حضرت زیدؓ کو ایک مقررہ طریق کار کا پابند کر دیا تھا۔
ازاں جملہ ضروری امور یہ تھے کہ:

(۱) ترتیب متن کے تعین کے لیے شہادات سے مدد لی جائے اس طرح کہ حضرت

Marfat.com

ابی بن کعبؓ (جو خود بھی عہد نبویؐ کے حفاظ میں سے تھے) خاص طور پر حضرت زیدؓ کی مدد کے لیے مقرر ہوئے تھے۔

(ب) ضروری تھا کہ متن قرآن صرف حافظے کے ذریعے نہیں بلکہ تحریر سے متعین کیا جائے اور ہر تحریر پر اس بات کی گواہی لی جائے کہ یہ آیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھیں۔ اس شرط کو پورا کرنے کے لیے حضرت زیدؓ کو مسجد نبوی میں آنے والے تمام لوگوں سے مدد لینا ضروری تھا۔ اور فی الواقع انہوں نے ایسا کیا۔ بلکہ لوگوں کے گھروں میں بھی جانا پڑا اور بعض دفعہ مدینہ منورہؐ سے کئی دن کے فاصلے پر موجود صحابہؓ سے بھی رابطہ قائم کرنا پڑا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں رکھے ہوئے صحائف سے کام لینے نیز اپنی ذاتی تحریروں اور حافظے سے مدد لینے کے باوجود حضرت زیدؓ ابن ثابت کا متعدد صحابہؓ سے مدد لینا اس لیے بھی ضروری تھا کہ متن قرآن کو تواتر کی بنا پر متعین و مرتب کیا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ آگے چل کر بعض علماء نے حضرت زیدؓ کی ان کوششوں اور اس طریق کار سے یہ نتیجہ اخذ کیا (اور اس کی تائید حضرت زیدؓ کے اختیار کردہ مخصوص رسم الخط سے بھی ہوتی ہے) کہ زیدؓ کے جمع کردہ نسخہ قرآن (بعہد صدیقی) میں سبعہ احرف کا لحاظ بھی رکھا گیا تھا۔ کیونکہ انہیں متنوع قراءات کے بارے میں نقل صحیح (گو غیر متواتر ہی ہو) کے حاصل ہونے کے امکانات زیادہ تھے۔ اگرچہ یہ بات واضح ہے کہ یہ نسخہ نقط اور شکل (حرکات) سے عاری تھا۔

۲۵۔ قریب ایک سال کے عرصے میں یہ نسخہ مکمل ہوا۔ اس نسخہ قرآن کو سب سے پہلے ''مصحف'' کا نام دیا گیا اور آئندہ نئی اصطلاح ''مکمل قرآن'' کے لیے

استعمال ہونے لگی۔ اسی بنا پر آگے چل کر دوسرے صحابہؓ کے انفرادی جمع کردہ نسخہ ہائے قرآن بھی اُن کے مصاحف کہلانے لگے۔ یہ "مصحف صدیقی" پورے کا پورا کاغذ پر یا کسی ایک مواد پر نہیں لکھا گیا تھا۔ کاغذ کے علاوہ جھلی اور کچھ دیگر مواد کتابت بھی استعمال کیا گیا تھا۔ کیونکہ اس وقت تک حجاز میں کاغذ یا باریک جھلی بھی عام دستیاب نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ "مصحف صدیقی" یکجا "مجلد" کتاب کی صورت میں نہ تھا بلکہ مختلف مواد کے چھوٹے چھوٹے مرتب مجموعے بنا دیئے گئے تھے اور اس طرح یہ مجموعے یا صحائف مل کر مکمل مصحف بنتا تھا۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے کسی کتاب کا مکمل مسودہ کسی فائل میں مرتب و مکمل شکل میں موجود ہو مگر اس کی شیرازہ بندی یا جلد بندی نہ کی گئی ہو۔ اس "مصحف" میں قرآن اور صرف متن قرآن ہی درج کرنے کا اس قدر اہتمام کیا گیا تھا کہ اس میں اسمائے سور بھی درج نہیں کئے گئے تھے۔ اور اسی چیز نے پہلے دن سے اس نسخہ --- دیگر صحابہؓ کے انفرادی مصاحف کے مقابلے پر --- ایک [illegible] خاص اہتمام والے نسخے کی حیثیت دے دی تھی۔ اور یہ خاص اہتمام بھی کسی ایک فرد کا نہیں بلکہ ایک اجتماعی کوشش کا نتیجہ تھا۔

۲۶۔ اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے دو سال کے اندر پورا قرآن مکمل و مرتب کتاب کی صورت میں بذریعہ تحریر بھی مدون ہو گیا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دو سال بھی اس خاص اہتمام والے نسخے کی تکمیل کے [illegible] میں ہے کیونکہ یہ نسخہ [illegible] تمام [illegible] حالت میں مراجعت و احتیاط سے لئے تیار کیا گیا تھا۔ ورنہ یہ پہلا مکمل نسخہ قرآن نہیں تھا۔ [illegible] بلکہ اس سے پہلے کئی صحابہؓ نے اپنے انفرادی مصاحف مکمل کر لیے تھے اور

Marfat.com

انہی مصاحف کے ذریعے آگے قرآن کریم کے پڑھنے پڑھانے کا کام جاری تھا اور جاری رہا۔ اپنے ذاتی مصاحف کو مکمل کرنے میں بعض صحابہؓ و صحابیاتؓ نے اس ''مصحف صدیقی'' سے مدد ضرور لی تھی لیکن تمام مصاحف کی اصل یہی اور صرف یہی نسخہ نہیں تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں صحابہؓ کے مشورے اور اجماع سے رمضان المبارک میں نمازِ تراویح کے باجماعت قیام اور اس میں پورا قرآن پڑھے جانے کا رواج ڈالا۔ اس کے باوجود پورے عہد فاروقی میں متن قرآن کے بارے میں کسی اختلاف کا ذکر تک نہیں ملتا۔ سبعہ احرف کا اختلافؐ موجود تھا، لیکن اُس کی حقیقت سے آگاہ ہونے کے باعث کبار صحابہؓ نے اس اختلاف پر کوئی جھگڑا تو درکنار کسی تعجب کا اظہار بھی کم کیا۔ اس زمانے تک ''مصحف صدیقی'' کو ایک مہتم بالشان نسخے کی حیثیت تو حاصل تھی مگر اس اہتمام کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ عہد عثمانی میں ہوا جب عجمیوں کے اختلاط اور بعض دیگر اسباب کی بناء پر سبعہ احرف کا استعمال ایک فتنہ بننے لگا۔ اس وقت اس نسخے (مصحف صدیقی) کو ہی اصل بنا کر نیا ایڈیشن تیار کیا گیا۔ اس کا ذکر ابھی آگے آرہا ہے۔

مصحف صدیقی کی تیاری حضرت ابوبکر صدیقؓ کے کارناموں میں سے ایک نمایاں کارنامہ اور تاریخ حفاظت متن قرآن کے مراحل میں سے ایک اہم مرحلہ ہے جس کے متعلق بعض مسیحی مستشرقین نے اس حسرت کا اظہار کیا ہے کہ کاش! مسیح (علیہ السلام) کے فوراً بعد ان کے تلامذہ اور پیروکاروں میں سے بھی کسی کو ان کی تعلیمات کو بصورت کتاب مرتب و مدون کرنے کی سوجھتی۔ تاریخی طور پر یہ نسخہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بعد حضرت عمرؓ کے

Marfat.com

پاس اور اُن کے بعد حضرت حفصہؓ کے پاس رہا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اس نسخے کی اہمیت اور اس کی تیاری میں پوشیدہ مقصد اور حکمت کا ایک اور پہلو ظاہر ہوا جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

۲۷۔ عہد صدیقی اور عہد فاروقی میں اسلام ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک تک پھیل گیا۔ اس عرصے میں لاکھوں غیر عرب بھی اسلام میں داخل ہوئے۔ کسی مسلمان کے قرآن کی تعلیم سے یکسر نابلد ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے اسلامی سلطنت میں ہر جگہ قرآن کریم کی تعلیم (حفظ، ناظرہ اور فہم) کا کام جاری رہا۔ صحابہ کرامؓ مختلف ممالک و امصار میں پھیل گئے تھے۔ ان میں سے کئی ایک نے مختلف علاقوں کے اہم مقامات پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ بعض بزرگ صحابہؓ (خصوصاً وہ جنہوں نے عہد نبوی ہی میں پورا قرآن نہ صرف حفظ کر لیا تھا بلکہ تحریری صورت میں اپنے مصاحف بھی "مصحف صدیقی" کی تدوین سے قبل ہی مرتب یا حاصل کر لیے (دیکھئے اسی مضمون کا پیرا نمبر ۱۹) نے اپنے علاقوں میں تعلیم قرآن کے بانی اور مرکز کی حیثیت اختیار کر لی تھی (مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابوموسیٰ اشعری عراق میں اور ابی بن کعب شام میں تعلیم دیتے تھے۔ ویسے تمام صحابہؓ اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے علم کی حد تک معلم قرآن کا فرض بھی سرانجام دے رہے تھے --- قرآن کی تعلیم کی وسعت کے ساتھ مکتوب مصاحف کی تعداد میں اضافہ ایک منطقی نتیجہ تھا۔ ۱۹، ۲۰ ہجری میں مصر کی فتح کے بعد سے چونکہ (کاغذ) نسبتاً سستا اور بکثرت دستیاب ہونے لگا تھا۔ اس سے بھی مصاحف کی اشاعت بذریعہ کتابت میں آسانی اور سہولت پیدا ہوئی۔ اس طرح خلافت عثمانی کے آغاز (محرم ۲۴ ہجری) تک قرآن

کریم کی کتابت اور قراءت کا کام وسیع و عریض اسلامی مملکت کے کونے کونے میں ہونے لگا تھا۔ یہ تمام مصاحف قرآن کریم کے مکمل رائج نسخے — مختلف صحابہؓ کے حافظے اور ان کے ذاتی و انفرادی مصاحف کے ذریعے نقل درنقل ہو کر اشاعت پذیر ہو رہے تھے — اس پورے عرصے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں باہتمام خاص مدون ہونے والے نسخے کو استعمال کرنے کی وہ متوقع یا موہوم ہنگامی صورت بفضل خدا در پیش ہی نہیں آئی (یعنی حفاظ کی اکثریت کا معدوم ہوجانا) — جو اس کی تیاری کا محرک بنی تھی۔ زیادہ سے زیادہ مدینہ منورہ میں قیام پذیر صحابہؓ یا تابعین میں سے بعض اپنے ذاتی مصاحف کی پڑتال یا تکمیل کے لیے وقتاً فوقتاً اس سے مدد لے لیا کرتے تھے۔

۲۸۔ کتابت و قراءت قرآن کریم کی اس وسیع پیمانے پر اشاعت کے ساتھ ان دس بارہ برس میں آہستہ آہستہ ایک اور مسئلہ بھی پیدا ہوا بلکہ خاصی شدت اختیار کر گیا — اور یہ تھا اختلاف قراءات کا مسئلہ۔ یعنی کچھ لوگ قرآن کریم کے بعض الفاظ ایک طریقے پر لکھتے اور پڑھتے تھے تو کچھ دوسرے طریقے پر — اس اختلاف کے پیدا ہونے کے کئی اسباب تھے۔

(۱) ایک بڑی وجہ تو اختلاف لہجات تھا۔ عرب کے مختلف قبائل کی زبان تو عربی ہی تھی مگر ان کی بولیوں (Dialects) لب و لہجہ اور محاورۂ زبان میں اختلافات ضرور تھے مثلاً بنوہذیل حتی کو عتی بولتے تھے۔ بنوتمیم ہمزہ نہیں بولتے تھے۔ بنواسد کے لوگ مضارع کو زیر سے پڑھتے تھے۔ مثلاً تعلمون کو تعلمون اور تسود کو تسود --- اسی طرح بعض قبائل لفظ ''اسن'' (ماء غیر اسن میں یاسن بولتے تھے وغیرہ (اور دنیا کی ہر زبان کے اندر مختلف خطوں اور لوگوں میں ایسے

Marfat.com

اختلافات عام ہوتے ہیں) --- فتح مکہ کے بعد جب عرب کے قریباً تمام قبائل مسلمان ہوگئے۔ اور ان مختلف لہجات رکھنے والے لوگوں کو قرآن پڑھنا ضروری ہوا (کم از کم نمازوں میں تو کچھ نہ کچھ حصہ قرآن پڑھنا لازمی تھا) --- تو اس قسم کے الفاظ ہر قبیلے کے آدمیوں کو اپنے بچپن سے پختہ لب و لہجہ کے مطابق ہی پڑھنا آسان تھے۔ بڑی عمر کے آدمیوں کو اپنا مخصوص لہجہ چھوڑ کر قرآن کریم کو اہل حجاز خصوصاً قریش کے لہجے میں پڑھنا (جو قرآن کا سب سے پہلا لہجہ تھا) دشوار (۹) تھا۔ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بحکم الٰہی ہر ایک قبیلے کو اپنی ہی بولی اور لہجے کے مطابق قرآن پڑھنے کی اجازت دے دی۔ مختلف قبائل کے متعدد لوگ قرآن پڑھ کر آگے قرآن پڑھانے بھی لگے۔ فتوحات اسلام کے ساتھ غیر عرب مسلمانوں کی تعداد بڑھی۔ ہر نئے مسلمان کے لیے قرآن کریم کی کم از کم ناظرہ تلاوت اور بقدر نماز حفظ ضروری تھا --- اب ایسا --- ہوتا کہ مثلاً کسی کو بنو ہذیل کے کسی آدمی سے قرآن پڑھنے کا اتفاق ہوا --- دوسرے کو کسی اسدی یا تمیمی یا قرشی سے اور ہر ایک املاء اور تلفظ دونوں میں اپنے ہی استاد کی پیروی کرتا تھا --- عرب تو پھر بھی اس قسم کے اختلاف کی حقیقت سے آگاہ ہوتے تھے۔ لیکن عجمیوں کیلئے قرآن کے الفاظ میں تلفظ کے علاوہ املاء کا بھی اختلاف ناقابل فہم تھا --- ہر شخص اپنے تلفظ اور املاء کو صحیح اور دوسرے کو غلط کہنے پر مجبور تھا --- یعنی خدا کے کلام کو "غلط" پڑھنا بلکہ اس پر اصرار کرنا واقعی کسی بھی مسلمان کیلئے ناقابل برداشت تھا --- اس لیے وقت گزرنے کے ساتھ جھگڑوں کی اطلاعات ملنے لگیں۔

(۲) اختلاف قراءت کا دوسرا سبب خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے "سبعة احرف" کی اجازت بھی تھی۔ اس کی مذکورہ بالا لسانی اختلاف

Marfat.com

کے ایک امر واقعی ہونے کی بنا پر بعض حضرات نے ''سبعہ احرف'' سے مُراد بھی یہی لہجات لیے ہیں مگر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن کریم کے بعض الفاظ کی ایک سے زائد قراء ات بسند صحیح ثابت ہیں --- مثلاً مالك يوم الدين اور ملك يوم الدين --- یا مثلاً فتبينوا اور فتثبتوا۔ اس قسم کا ''اجازت یافتہ'' اختلاف بھی دوسری قراء ت یا اس کی سند سے لاعلمی کے باعث دو پڑھنے والوں میں جھگڑے کا باعث بن جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے اسی مضمون کے پیرا نمبر۱۴ میں بیان ہو چکا ہے ''سبعہ احراف'' ایک تفصیل طلب مضمون ہے۔ یہاں صرف اتنا واضح کر دینا مقصود ہے کہ غیر اہلِ علم کے لیے لہجاتی اختلاف کی طرح یہ ثابت اور ''اجازت یافتہ'' اختلافِ الفاظ بھی ذہنی الجھن اور دوسروں سے اُلجھ پڑنے کا باعث ہو جاتا تھا۔

(۳) اختلافِ قراء ات کا تیسرا سبب ایسی انفرادی خطا اور غلطی بھی ہو جاتی تھی جو کسی خاص سبب کے باعث یا اتفاقاً کسی ایک پڑھانے والے سے سرزد ہوئی اور پھر اس کے تلامذہ نے اسے ہی درست سمجھ لیا۔ اس وقت تک کتابت میں اعجام و نقط نہ ہونے کی وجہ سے اس قسم کی خطا کے امکانات بھی زیادہ تھے۔ اس کی کچھ مثال آج کل کی طباعت یا کتابت کی ایسی اغلاط کی سی تھی جسے پڑھاتے ہوئے استاد بھی درست نہ کر سکا ہو اور شاگرد اسے درستی کی سند قرار دے لے --- اس اختلاف قراء ت میں مزید جذباتی شدت اس وقت پیدا ہو جاتی تھی جب فریقین ایک دوسرے کے قرآن کو غلط اور اُستاد کو کم تر (علمی) درجے کا آدمی قرار دینے لگتے۔ اور اس بحث میں ان جلیل القدر صحابہؓ کے نام بھی شامل کر لیئے جاتے تھے جو اپنے اپنے علاقے میں تعلیم قرآن کی سند اور بنیاد تسلیم کئے جاتے تھے --- اس قسم کے اختلاف کو (سابق دو قسم

Marfat.com

کے اختلافات کے برعکس) کسی طرح بھی جائز قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن اس کا وجود بھی تو کم علمی کے باعث --- خصوصاً عجمیوں میں --- جھگڑے کا باعث بن جاتا تھا --- لہذا اس قسم کی انفرادی خطا کے امکان کو روکنے کیلئے بھی کسی مثبت اقدام کی ضرورت کا احساس پیدا ہونا لازمی تھا۔

۲۹۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے شروع میں اس قسم کے اختلافات کی بنا پر تصادم اور جھگڑوں کی خبریں ملنے لگیں۔ تعلیم قرآن کے بعض مدرسوں میں اُستادوں کے درمیان اور بعض دفعہ تو شاگردوں اور استادوں کے درمیان بھی تصادم ہوتے ہوتے بچا --- لیکن اس قسم کے تصادم کی سب سے زیادہ پریشان کن صورت حال فوج میں ملاحظہ کی گئی۔ اور یہی چیز دراصل اس وقت زیر بحث اہتمام کا فوری محرک بنی۔ اور شاید اسی لیے کتب تاریخ میں عموماً دوسرے اکا دکا واقعات کی بجائے حضرت عثمانؓ کے اقدام کے محرک --- آرمینیہ اور آذربائیجان کے محاذ پر پیش آنے والا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جس کی تفصیل یوں ہے:۔

۳۰۔ آرمینیہ اور آذربائیجان (موجودہ ایران اور ترکی کی سرحدوں کے ساتھ متصل علاقے جو ۱۸۱۳ء سے روس کے قبضے میں ہیں) میں مسلمان عہد فاروقی میں پہنچ گئے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اس محاذ پر کچھ بغاوتیں فرو کرنی پڑیں۔ اور کچھ مزید علاقے بھی مفتوح ہوئے۔ اس محاذ پر ابتداء میں شام کے محاذ سے فوج بھیجی گئی مگر کمک کی ضرورت پیش ہوئی اور کوفہ (عراق) سے وہاں کے مرکزی ایرانی محاذ پر اس وقت مسلمانوں کے مشہور جرنیل حذیفہؓ بن الیمان عراقی فوج کے ساتھ مذکورہ محاذ پر بھیجا حذیفہؓ کو جنگ کی اگلی لائنوں تک بھی جانا پڑا۔ یہاں انہوں نے عراقی

اور شامی فوجیوں کو اپنے اپنے مصاحف کے اختلاف قراءات پر آپس میں لڑتے دیکھا --- عراقیوں اور شامیوں کی مخاصمت یوں بھی بہت پرانی --- رومیوں اور ایرانیوں کے زمانے سے --- چلی آتی تھی --- ہر ایک میں دوسرے کے مقابلے پر ایک احساس برتری پایا جاتا تھا آذربائیجان، آرمینیہ کے محاذ پر ان ''تاریخی رقیبوں'' کو اسلام کے جھنڈے تلے قریباً پہلی دفعہ اکٹھا ہونے کا موقع ملا --- تو بعض اُمور میں اس قدیم علاقائی تعصب کے اثرات کا کچھ مظاہرہ ہونے لگا --- مثلاً ایک موقع پر مالِ غنیمت کے سلسلے میں بھی عراقی و شامی فوجی آپس میں اُلجھ پڑے --- دوسرے موقع پر اپنے اپنے افسروں کی حمایت میں بعض عراقی اور شامی شعراء میں تلخ نوک جھونک ہوئی۔ یہ اُمور کسی حد تک نظر انداز کئے جاسکتے تھے۔ لیکن جب قرآن کریم کو بھی اس جھگڑے اور رقابت میں داخل کر دیا گیا اور غلط یا صحیح (۱۰) اختلافاتِ قراءت کو بھی اپنی اپنی فضیلت کے کھاتے میں ڈال کر مذہبی جذبات مشتعل کئے جانے لگے اور وہ بھی عین محاذ جنگ پر، تو یہ صورت حال واقعی خاصی پریشان کن تھی۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اہل عراق میں رائج مصاحف کی اصل زیادہ تر مصحف عبداللہ ابن مسعودؓ اور اہل شام کے مصاحف کی بنیاد بیشتر مصحف ابیؓ بن کعب تھے۔ اسی طرح بعض دیگر قراء صحابہؓ کے مصاحف بھی ان علاقوں میں اشاعتِ قرآن کی بنیاد بنے تھے --- ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اختلافِ قراءت پر جھگڑنے والے فریقین ''فلاں صحابی کا قرآن'' اور ''فلاں کا مصحف'' کہہ کر اپنی اپنی بات میں ذرا وزن پیدا کرنا چاہتے۔ یہ بات اہل کتاب کی دینی کتب کے مختلف بزرگوں کے ناموں سے منسوب ہو جانے کے مانند تھی --- مزید برآں جاہلانہ

عصبیت کی بنا پر تصحیف کی حمایت کسی وقت عمداً تحریف کی صورت اختیار کرسکتی تھی --- ان سب امور نے حضرت حذیفہؓ کو بے چین کر دیا اس محاذ پر جانے سے پہلے کوفہ میں بھی اس قسم کے اختلافات قراءت دیکھ کر انہوں نے قرآن کریم کے ایک مستند نسخے کی اشاعت کی ضرورت محسوس کی تھی محاذ (آرمینیہ) سے واپسی پر وہ پہلے کوفہ آئے۔ وہاں انہوں نے بعض دوسرے صحابہؓ سے اس صورت حال اور اپنی تجویز کا ذکر کیا۔ بہت سے صحابہؓ نے ان کی تائید کی حذیفہؓ اسی سال حج کے لیے روانہ ہوئے اور مدینہ منورہ میں حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ ساری رپورٹ دی اور ان سے قرآن میں اختلاف کے سد باب کی تجویز پیش کی۔ حضرت عثمانؓ پہلے ہی اس قسم کے واقعات سے متاثر تھے۔ اب انہوں نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا اور اجماعی طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ قرآن کریم کا ایک مستند نسخہ شائع کیا جائے۔ اس کی نقول (جلدیں) مختلف اہم مقامات پر پبلک کیلئے رکھ دی جائیں تاکہ سب لوگوں کو اپنے مصاحف کی تکمیل اور پڑتال کیلئے ایک مستند اصل میسر ہو اور اختلاف کے امکانات ختم ہو جائیں۔

۳۱۔ حضرت عثمانؓ نے قرآن کریم کے اس نئے ایڈیشن کیلئے مصحف صدیقی کو ہی اصل بنایا۔ یہ مصحف کسی ہنگامی صورت حال میں مرتب ہونے کی بجائے تیار کیا گیا تھا۔ اس کی تدوین و کتابت ایک اتفاقی اجتہاد سے عمل میں آئی تھی۔ اسے بھی مدت ہو چکی تھی۔ اس کام کے ماہر اور قرآن کے کاتب زید بن ثابت بقید حیات موجود تھے۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت صدیقؓ کے طریق پر عمل کرتے ہوئے مصحف صدیقی سے نیا ایڈیشن (مزید نقول) تیار کرائے

کیلئے حضرت زید بن ثابتؓ ہی کو مقرر کیا۔ البتہ مدد اور مشورے کیلئے تین آدمیوں عبداللہ بن الزبیرؓ، سعیدؓ بن العاص اور عبدالرحمٰن بن الحارثؓ پر مشتمل ایک کمیٹی بھی ان کے ساتھ بنا دی گئی۔ مصحف صدیقی اس وقت ام المومنین حضرت حفصہؓ کی تحویل میں تھا۔ نسخہ اُن سے حاصل کر کے نئے نسخے تیار کرنے کا کام شروع کر دیا گیا۔

۳۲۔ اس وقت حضرت عثمانؓ اور صحابہ کرامؓ کے سامنے اصل مسئلہ قرآن کریم کے نسخوں کی محض ''قلت'' دور کرنے کیلئے کثیر تعداد میں نقول یا قرآنی نسخے مہیا کرنے کا نہیں تھا۔ اصل مسئلہ اختلاف قراءات کو ختم کرنا تھا۔ جہاں تک نسخوں کی اغلاط یا ان میں تصحیف کا تعلق تھا اُسے دُور کرنا نسبتاً آسان تھا۔ دقت یہ تھی (جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ (دیکھئے پیرا نمبر ۲۹) کہ اختلاف قراءت کی دو ایسی صورتیں بھی موجود تھیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ''اجازت یافتہ'' تھیں اور دراصل عجمیوں کیلئے یہی وجہ نزاع بن رہی تھیں یعنی لہجات کا قبائلی اختلاف اور سبعہ احرف کے تحت ثابت تنوع قراءات۔

لہجات کے اختلاف کے بارے میں حضرت عثمانؓ نے بمشورہ صحابہؓ یہ فیصلہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ اجازت خاص حالات کی بنا پر قبائل عرب کے معمر لوگوں کی سہولت کیلئے تھی۔ اب جب کہ عجمیوں نے بھی قرآن کریم پڑھنا ہے تو اس کیلئے کیوں نہ کوئی یکساں طریق اختیار کیا جائے؟ اور اگر یکسانیت ضروری ہے تو اس کی بنیاد لہجہ قریش ہونی چاہئے کہ شروع میں قرآن کریم صرف اسی لہجے کے مطابق پڑھا جاتا رہا تھا۔ اس لیے ایک تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ مختلف قبائلی لہجات اختیار کرنے کی اس اجازت کو ختم کر دیا جائے۔ اس

Marfat.com

مقصد کیلئے مذکورہ بالا کمیٹی کو کتابت و املاء الفاظ میں بصورت امکان اختلاف لہجہ قریش کے اتباع کا حکم دیا گیا۔ کمیٹی کے ارکان میں تین قریشیوں کے مقرر کرنے کی وجہ بھی یہی تھی۔ سبعہ احرف کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بطریق صحیح ثابت تنوع قراءت کی مقدار اگرچہ اتنی زیادہ نہیں تھی جتنا لفظ "سبعہ" سے متبادر ہوتا ہے۔ قرآن کریم کا ہر ایک لفظ سات مختلف طریقوں پر نہیں پڑھا گیا اور نہ ہی ہر لفظ میں اختلاف لازمی تھا۔ تاہم اس تنوع یا اختلاف کو لہجات کے اختلاف کی طرح یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے کہ یہ تنوع بظاہر کسی وقتی مصلحت پر مبنی نہیں تھا بلکہ یہ ایک طرح سے قرآن کا لغوی کمال اور ادبی جمال تھا --- بنا بریں اس قسم کے اختلاف یا تنوع کے بارے میں یہ طے پایا کہ اول تو ایسے اختلاف کو سند کی قوت وصحت سے پرکھ لیا جائے --- مختلف قراءات میں سے اگر کوئی ایک قرآن ہونے کی قوت سند (تواتر) سے محروم ہو تو اسے ترک کر دیا جائے (مثلاً بعض صحابہؓ کے مصاحف میں تفسیری اشارات بھی تھے جو اصل متن قرآن کا حصہ نہ تھے) اگر کسی لفظ کی دو مختلف قراءتیں یکساں مستند ہوں تو پھر کوشش کی جائے کہ اس کی املاء ایسے طریقے پر کی جائے کہ دونوں قراءتوں کا احتمال موجود ہے (۱۱) اور بالفرض دو متنوع قراءات کیلئے ایک طریق املاء اختیار کرنا ممکن نہ ہو تو پھر ایک (نسبتاً کم مستند) کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اس طرح اس کمیٹی کیلئے طریق کار کے جو بنیادی اصول متعین کر دیئے گئے اُن کا خلاصہ یہ تھا کہ (۱) غیر معتبر قراءات سے نص قرآن کو پاک کرنا (۲) صحیح مختلف قراءات کو ایک نص میں مدون کرنا اور (۳) اس مقصد کیلئے لہجہ قریش اور تنوع قراءات کو ملحوظ رکھتے ہوئے املاء یا رسم الخط کا تعین کرنا۔ اور دراصل سب سے اہم کام جو اس کمیٹی نے کیا وہ یہی رسم الخط کی تعیین تھی۔ یہ رسم الخط رسم

عثمانی'' کے نام سے مشہور ہوا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے سے لے کر آج تک پوری دُنیائے اسلام میں قرآن کریم کی کتابت میں اسی طریق املاء یعنی ''رسم عثمانی'' کا اتباع کیا جاتا ہے۔ اس متعین و منضبط اور یکساں رسم الخط کے ذریعے اختلاف قراءات یکسر دُور نہ ہو سکا --- (اس کی وجہ آگے بیان ہوتی ہے) تاہم اختلاف کی صورت میں معتبر اور غیر معتبر قراءت کی تمیز کا بنیادی اُصول طے کر دیا گیا۔

۳۳۔ عثمانی ایڈیشن کی تیاری دراصل صدیقی ایڈیشن ہی کی نشرواشاعت کی ایک صورت تھی۔ مصحف صدیقی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عرضہ اخیرہ کے مطابق ہونے کی بنا پر ایک طرح سے خود جمع رسولؐ یا ''نبوی ایڈیشن'' ہی تھا۔ حضرت زیدؓ نے اس وقت بھی کتابت میں حضورؐ کی املاء کرائی ہوئی تحریروں کے حصول پر زور دیا تھا۔ اور (جیسا کہ پہلے پیرا نمبر ۲۴ میں بیان ہو چکا ہے)

غالباً مصحف صدیقی میں سبعہ احرف کا لحاظ رکھ کر املاء متعین کی تھی مصحف یہی وجہ ہے کہ الفاظ کی املاء کی تعیین یا تبدیلی کے بارے میں اس کمیٹی کے ارکان کے مابین اختلاف کے واقعات نہ ہونے کے برابر بیان ہوئے ہیں۔(۱۲) اور یہی وجہ تھی کہ کمیٹی نے تھوڑے سے عرصہ میں نئے ایڈیشن کے کم از کم پانچ اور بعض روایات کے مطابق سات آٹھ نسخے تیار کر لیے اور اصل نسخہ حضرت حفصہؓ کو واپس کر دیا گیا۔ مصحف ابی بکرؓ ایک ہی قسم کے مواد کتابت پر نہیں لکھا گیا تھا۔ مگر مصاحف عثمانی جھلی پر لکھے گئے۔ اس لیے یہ صحائف کی صورت میں نہیں بلکہ ہر ایک ایک مجلد نسخہ قرآن کی صورت میں تھا۔ پیپرس (کاغذ) کے مقابلے پر (جو اس وقت بہرحال

اسلامی سلطنت میں دستیاب تھا) جلی کو ترجیح دینے کی وجہ اول تو اس کی پائیداری تھی۔ اور اس لیے بھی کہ اس وقت تک (بلکہ بعد میں پہلی دوسری صدی ہجری تک بھی) کتابتِ قرآن کے لیے عموماً وسیع و عریض مواد اور جلی قلم کا استعمال اس کی تعظیم کا تقاضا سمجھا جاتا تھا۔ مصحف ابی بکرؓ کی طرح مصاحفِ عثمانی میں بھی اسماء سور اور فواصل نہیں تھے البتہ ہر سورت کے آغاز میں بسم اللہ لکھی گئی تھی ماسوائے سورت ''التوبہ'' کے۔ اسماء سور قراء میں متعارف تھے مگر متنِ قرآن کو ہر طرح کے غیر قرآن الفاظ سے پاک رکھنے کے لیے بطورِ عنوان سورت نام بھی لکھنا گوارا نہیں کیا گیا۔ مصحف ابی بکرؓ کی طرح یہ نسخے بھی اعجام وشکل (نقاط وحرکات) سے عاری تھے۔ ابھی تک عربی کتابت میں ان چیزوں کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ ان نسخوں میں سورتوں کی ترتیب بھی مصحف صدیقی ہی کے مطابق تھی (۱۳) بروایات صحیحہ یہ کام ۲۵ھ کے بعد شروع ہوا اور ۳۰ھ سے پہلے ختم ہو چکا تھا۔

۳۴۔ حضرت عثمانؓ نے ان تیار کردہ نسخوں میں سے ایک ایک نسخہ مختلف صوبوں کے صدر مقامات پر بھجوایا اور حکم دیا کہ یہ مصحف شہر کی جامع مسجد میں پبلک کے لیے ہر وقت موجود رہیں۔ (اس قسم کے عوامی استعمال کا مقابلہ بھی پیپرس (کاغذ) کی بجائے جھلی بہتر کرسکتی تھی) اس مقصد کے لیے مکہ المکرمہ، مدینہ منورہ، بصرہ، کوفہ اور دمشق میں ایک ایک نسخے کا بھیجا جانا تو معروف ہے ایک نسخہ حضرت عثمانؓ نے اپنے ذاتی استعمال کے لیے رکھا ہوا تھا۔ ان چھ نسخوں کے علاوہ یمن اور بحرین میں بھی ایک ایک نسخہ بھیجنا بیان کیا جاتا ہے --- جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ ان مصاحف میں رسم الخط اور املاء کی تعیین کے ذریعے اختلاف قراءات کو ختم کرنے کے لیے کی بنیاد

Marfat.com

کی گئی تھی تاہم اس وقت تک عربی خط میں ہم شکل حروف کی تمیز بذریعہ نقاط (اعجام) اور کلمات کا تلفظ بذریعہ حرکات (شکل) کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اس ساری محنت اور کوشش کے باوجود الفاظ و کلمات کے مختلف طریقوں پر پڑھے جانے کا امکان ضرور تھا۔ مگر قرآن کریم کے بارے میں عہد نبویؐ سے ہی تعین قراءت محض احتمال کتابت (رسم الخط) سے نہیں بلکہ سند روایت سے ہوتا تھا۔ اس کمیٹی نے نئے ایڈیشن میں جن مقامات پر ''اجازت یافتہ قبائلی لہجات'' یا نسبتاً غیر معتبر ''قراءات'' کو ختم کرنے کیلئے متعین رسم الخط اختیار کیا تھا ان سے بطریق سماع و تلقی آگاہ کرنے کیلئے حضرت عثمانؓ نے ہر مصحف کے ساتھ اس کے متعلقہ شہر میں ایک قاری بھی مقرر کر کے بھیجا۔ خیال رہے کہ قرآن کریم تو پہلے بھی ہر جگہ پڑھا اور پڑھایا جارہا تھا صرف اختلافاتِ قراءات تھے۔ رسم الخط کے تعین سے بہت سے اختلافات خود بخود ختم ہو جاتے تھے۔ مقرر رسم الخط کے باوجود اعجام و شکل کے نہ ہونیکی وجہ سے تلفظ کی مختلف صورتوں کے امکان کو روکنے کے لئے مستند قاری کے ذریعہ تعلیم ضروری تھی۔ کتابوں میں حضرت عثمانؓ کے نام فرستادہ اور مقرر کردہ قراء اس طرح دیئے گئے ہیں۔ مدینہ منورہ کے لیے (خود) زیدؓ بن ثابت، مکہ مکرمہ کیلئے عبداللہؓ بن السائب۔ شام (دمشق) کیلئے مغیرہؓ بن شہاب، کوفہ کیلئے ابو عبدالرحمٰنؒ السلمی اور بصرہ کیلئے عامرؒ بن قیس (۱۴)

۳۵۔ ان مصاحف کی تیاری اور اشاعت کے بعد حضرت عثمانؓ نے صحابہؓ کے مشورہ اور اجماع سے ہی یہ فیصلہ بھی کیا کہ مختلف علاقوں میں جو غلط اختلافات اور باہم مخالف قراءات رکھنے والے مصاحف رائج ہو چکے ہیں

وہ یا تو اس مستند ایڈیشن کے مطابق درست کر لئے جائیں یا بحق سرکار ضبط کر کے تلف اور ضائع کر دیئے جائیں۔ ان نسخوں کو تلف کرنے کے لئے مکتوب علیہ مواد جلا ڈالنے، پھاڑ دینے یا بعض دفعہ تیزاب وغیرہ سے دھو ڈالنے کا عمل اختیار کیا گیا --- اس کا مطلب یہ نہیں کہ خراسان سے مصر اور دربند سے صنعاء تک پھیلی ہوئی اسلامی سلطنت میں موجود ہر نسخہ قرآن (ان چھ سات نسخوں کے علاوہ) تلف کر دیا گیا۔ ایسا ہونا ہی ناممکن تھا اور ایسا کرنا حضرت عثمانؓ یا کسی بھی اور کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ بفرض محال ایسا ہو بھی جاتا تو سینوں سے قرآن کس طرح نکالا جا سکتا تھا۔ بات دراصل ''نیا قرآن'' ٹھونسنے کی نہیں تھی اپنے اپنے نسخہ قرآن کو صحابہ کے اجماعی اہتمام سے شائع ہونے والے صحیح ترین نسخہ کے مطابق ٹھیک کر لینے کی تھی۔ بعض یا بہت سے ''غلطیوں والے'' نسخوں کے اتلاف سے لوگوں کے ذہنوں میں ''صحت متن قرآن'' کے اہتمام اور اہمیت کو واضح کرنا مقصود تھا۔ (۱۵) اگر مصحف عثمانی سے کچھ بھی اختلاف رکھنے والے ہر نسخہ قرآن کا اتلاف مقصود ہوتا تو پھر مصحف ابی بکر بھی (جس کے بعض الفاظ یقیناً بدلے گئے تھے، گو رسم الخط کی حد تک ہی سہی) فوراً جلا دیا جانا چاہئے تھا۔ دراصل ''غلطیوں والے مصاحف'' کے ضائع کرنے کی ضرورت بھی اس لئے محسوس ہوئی کہ ایک تو شاید بعض لوگ محض ضد یا محض ناواقفیت کی بنا پر غلط کو ہی درست سمجھنے پر اصرار کرنے لگیں دوسرے مصاحف عثمانی کی اشاعت سے یہ انکشاف بھی ہوا کہ بعض جلیل القدر صحابہؓ کے ذاتی مصاحف میں --- (اور خود ان مصاحف سے متعدد مصاحف تیار ہو کر رائج ہو چکے تھے) کسی نہ کسی غلط فہمی کی بنا پر ایک آدھ ایسی شدید غلطی موجود تھی جسے ''بدعت

احرف'' کے تحت بھی کسی طرح جائز قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اب تک معوذتین کو قرآن کریم کی سورتیں ہی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ان سورتوں کو جانتے اور پڑھتے تھے مگر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سورتیں پڑھ کر حسنینؓ پر دم کرتے دیکھا تھا۔ اس بنا پر وہ انہیں صرف دعا سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس حضرت ابی بن کعبؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ کے مصاحف میں دعائے قنوت (برائے وتر) کو قرآن کریم ہی کا جزء (سورت) سمجھ کر لکھ دیا گیا تھا۔(۱۶) یہ بزرگوار ان چند صحابہ میں سے تھے جنھوں نے مصحف صدیقی سے الگ اس سے قبل یا بعد اپنے طور پر اپنے مصاحف مکمل کئے تھے۔ (دیکھئے اسی مضمون کا پیرا نمبر۱۹) ان کے نسخے اس اجتماعی اہتمام سے تیار نہیں ہوئے تھے جو مصحف صدیقی کی تیاری میں مدنظر رکھا گیا تھا --- اب صحابہ کرامؓ کی عظیم اکثریت کی زندگی ہی میں، مصحف ابی بکرؓ کی بنیاد پر مصاحف عثمانیؓ کے ذریعے صحیح متن قرآن کی اشاعت نے ان کی انفرادی غلطی واضح کر دی۔ ایک ہی آدمی کی تقریر سننے والے سو آدمیوں --- یا ایک ہی استاد کے سو شاگردوں میں سے ایک آدھ تو (نسبتاً زیادہ ذہین اور لائق ہوتے ہوئے بھی) وہی بات دوبارہ بیان کرنے میں غلطی کرسکتا ہے مگر یہ ناممکن ہے کہ صرف ایک دو ہی درست بیان کریں اور اکثریت سے وہ بات پوشیدہ رہ جائے --- بلکہ اس قسم کی غلطی کے انکشاف سے مصاحف عثمانی کی بروقت اشاعت کی قدر و قیمت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ ابتداء اگرچہ عبداللہ بن مسعودؓ نے بشری تقاضوں کے عین مطابق محض اپنی جلالت علمی اور سبقت فی الاسلام کی بنا پر (جس میں وہ یقیناً حضرت عثمانؓ کی تشکیل کردہ کمیٹی کے

بیشتر اراکین سے بدرجہا فائق تھے) اپنی بات پر اصرار کرنا چاہا --- مگر صحابہؓ کے اجتماعی علم کے سامنے بہت جلد انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور انہوں نے اپنے اصرار سے رجوع کرلیا۔

--- یہ بات ہمارے سلف صالحین کے حسن نیت، حقیقت شناسی اور حق پسندی کا ثبوت اور نمونہ ہے کہ محض ایک آدھ غلطی کے ارتکاب یا اس کی نشاندہی پر کسی کی دینی فضیلت یا علمی عظمت سے یکسر انکار بھی نہیں کر دیا جاتا تھا اور نہ ہی غلطی پر اصرار کو وقار کا سوال بنالیا جاتا تھا۔ ورنہ آج کل کیا ہم یہ نہیں دیکھ رہے کہ کسی آدمی (خصوصاً علمی و سیاسی طور پر نمایاں شخصیت) کو یا تو سو فیصد درست، برحق اور غلطی سے پاک مانا جاتا ہے یا پھر اسے سو فیصد مردود اور مجموعہ اغلاط تصور کرلیا جاتا ہے۔ اس قسم کا انتہا پسندانہ رویہ فطرت انسانی سے نا آگہی کی بنا پر اختیار کیا جاسکتا ہے۔

خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا ہم پھر اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔

۳۶۔ مصحف ابی بکرؓ کی اساس پر مصحف عثمانی کی تیاری اور اشاعت صحابہ کرامؓ کے اجماعی مشورہ اور فیصلہ کی بنا پر عمل میں آئی تھی۔ (اور اس وقت تک جلیل القدر صحابہؓ کی غالب اکثریت موجود تھی) یہی وجہ تھی کہ پورے عالم اسلامی میں صحت متن قرآن کے لئے مصاحف عثمانی کو بالاتفاق معیار صحت بلکہ اس مقصد کے لئے وقت کی اہم ضرورت تسلیم کرلیا گیا۔

--- کسی صحابی سے مصاحف عثمانی کے کسی ایک لفظ کی بھی صحت اور سند تواتر کے بارے میں شک یا اختلاف منقول نہیں ہے۔ اگر کوئی اختلاف ہوا بھی تو وہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجازت یافتہ اختلاف قراءات (سبعہ احرف) کو ختم یا محدود کرنے کے فیصلہ" سے اختلاف تھا۔ اس سلسلے میں عموماً سب

سے زیادہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اختلاف اور تلخ رویہ کا ذکر کیا جاتا ہے اس پر تفصیلی بحث تو آگے آئے گی۔ یہاں اتنا بتا دینا کافی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (یا کسی بھی اور صحابی) نے کبھی یہ نہیں کہا کہ حضرت عثمان کے ایڈیشن میں فلاں لفظ یا عبارت بالکل غلط اور بے سند ہے۔ نہ ہی انہوں نے مصاحف عثمانی میں اختیار کردہ قراءات کی بجائے اپنی کسی قراءت کے رکھے جانے پر اصرار کیا۔ وہ صرف صحابہؓ کی اجماعی سند اور تواتر سے ثابت صحیح و مختار نص کے ساتھ --- اپنی ذاتی سند کی بناء پر بعض جگہ اپنی قراءت بھی پڑھنے پر مصر تھے --- حضرت عثمانؓ اور ان کے ساتھ صحابہ کی غالب اکثریت نے سمجھ لیا تھا کہ ''سبعہ احرف'' کے تحت، ایک محدود دائرے کے اندر اختلاف بھی صرف جائز اور مصلحتاً ''اجازت یافتہ'' تھا۔ فرض اور واجب نہیں تھا کہ اسے لازماً برقرار رکھا جاتا اور اس حالت میں بھی جب کہ ایک دوسرے کی سند یا لہجہ سے ناواقفیت غیر عرب مسلمانوں کیلئے اختلاف سے بڑھ کر تنازعہ کی شکل اختیار کرنے لگی تھی۔ اس لئے ''سبعہ'' کے اذن کے نام پر رواج یافتہ بعض غیر معتبر اور غیر صحیح قراءات کا ترک ضروری سمجھا گیا --- مثلاً لہجوں کے تفاوت پر مبنی وہ قراءت جو ''اجازت یافتہ'' تو تھیں مگر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس قراءت سے پڑھنا ثابت نہ تھا۔ یا وہ قراءت جو بعض صحابہؓ کے نزدیک خود اُن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت تھیں مگر انکی قرآنیت پر تواتر کی شہادت موجود نہ تھی۔ یا ایسے تفسیری الفاظ جو بعض صحابہ نے اپنے مصاحف میں ذاتی استفادہ کیلئے نوٹ کئے تھے مگر انہیں بھی قرآنی قراءت سمجھا جانے لگا تھا۔ مصاحف عثمان کی تیاری کا مقصد مطلق ہر طرح کے اختلاف قراءت صحیح یا غلط، معتبر یا غیر معتبر کو یکسر ختم کرکے --- ایک --- اور صرف ایک ہی --- قراءت پر مجبور کرنا نہیں تھا --- ایسا کرنا عقلاً

Marfat.com

بھی درست نہ ہوتا۔ اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بطریق شہرت و تواتر ثابت، مختلف قراءت میں سے بعض کو بالکل ختم کرنے کی کوشش اور اختلاف بڑھانے والی بات ہوتی --- اس قسم کے متنوع مگر مصدقہ اور مستند اختلاف قراءات کو تسلیم کر کے انہیں برقرار رکھنے کیلئے ہی تو سوچ سمجھ کر "محتمل قراءات" رسم الخط (ہجا) کو اختیار کیا گیا --- بلکہ بعض صورتوں میں، جہاں اس قسم کا مشترک یا واحد رسم الخط (ہجا) ممکن نہ تھا وہاں کسی نسخے میں ایک قراءت اور کسی میں دوسری قراءت اختیار کی گئی (۱۷) اس طرح آسانی کیلئے کم سے کم اختلاف کی طرف رجوع کرتے ہوئے تمام متواتر اور معتبر قراءات کو مصاحف عثمانی کے طریق املاء اور رسم الخط کے اندر محصور کر دیا گیا۔ اب اس رسم الخط سے خارج قراءات کو محض ذاتی سند کی بناء پر پڑھنے کی اجازت تو تھی، مگر امت کو اس کا پابند کرنے --- یعنی نماز میں ایسی قراءات پڑھنے --- یا کتابت مصحف میں ایسی قراءات سے بحث و اشتغال کو مطلقاً ممنوع قرار نہیں دیا گیا تھا۔ (۱۸) یہی وجہ تھی کہ مصحف عثمانی سے خارج مگر عند البعض مستند انفرادی یا شاذ قراءات کے بارے میں مطالعہ اور بحث کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوا۔ (۱۹) بلکہ قراءات تفسیر، لغت، بلاغت اور حدیث و فقہ کی کتابوں میں ان کے استعمال اور حوالے کا رواج اپنے اچھے اور برے نتائج کے ساتھ جاری رہا۔

۳۷۔ مصاحف عثمانی کی اشاعت دراصل تعلیم قرآن اور حفاظت متن قرآن کے ان ہی دو بنیادی اصولوں کے مطابق عمل میں آئی جو عہد نبوی سے رائج اور نافذ چلے آتے تھے یعنی حفظ اور کتابت --- حفظ میں تلفظ (اور ترتیب الفاظ بھی) بذریعہ تلقی و سماع یعنی مستند آدمی کی زبان سے سن کر سیکھنا --- اور کتابت میں صرف مستند تحریر سے بعینہٖ نقل کرنا لازمی تھا۔

(دیکھئے اس مضمون کا پیرا نمبر ۱۲، ۱۳ اور ۱۹)

قرآن حفظ کرنے والا تو (کم از کم بعض صورتوں میں --- مثلاً نابینا یا بالکل ناخواندہ حافظ) صرف صحت تلفظ کیلئے استناد و بذریعہ تلقی و سماع کا محتاج ہوتا تھا اور یہ کام تحریر کے بغیر بھی سرانجام پاسکتا تھا۔ لیکن عام ناظرہ خواں طالب قرآن (خصوصاً کم علم یا غیر عرب عوام کو مستند تحریر سے مستند تلفظ سیکھنے کیلئے تعلیم کی ضرورت تھی۔

دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھئے کہ مطلق تعلیم تو بغیر تحریر یا کتابت کے محض زبانی یا شفاہی بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن اس قسم کی تعلیم کا دائرہ کبھی وسیع نہیں ہوسکتا۔ تعلیم اور علم کے عام کرنے کیلئے قلم (تحریر) کا استعمال لازمی ہے۔ علم بالقلم میں اسی سرعیاں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے --- پھر ایسی تعلیم یا خواندگی جس میں قلم، کتابت اور تحریر کا استعمال شامل ہو۔ اس کا پہلا مرحلہ (کسی تحریر کا) پڑھنا (Reading) ہے، دوسرا مرحلہ لکھ سکنا (Writing) اور تیسرا مرحلہ سمجھ سکنا (Understanding) ہے۔ قرآن کریم یا کم از کم اس کے کسی حصے --- کی تعلیم ہر ایک مسلمان کیلئے واجب ہے۔ اس واجب کے ادا کرنے کی کم سے کم صورت تو ''درست تلفظ کے ساتھ حفظ کرلینا یا زبانی پڑھ سکنا'' بھی ہوسکتا ہے --- لیکن تعلیم قرآن کو ہر ایک مسلمان تک پہنچانے اور اس میں عموم و وسعت پیدا کرنے کیلئے کتابت سے امداد لینا ضروری ہے --- لہذا تعلیم قرآن بذریعہ تحریر کا پہلا قدم ''مکتوب قرآن کو ٹھیک ٹھیک لکھا ہوا ہونا چاہئے --- اور درست پڑھنے کیلئے یا درست پڑھنا سکھانے کیلئے --- پڑھا جانے والا مواد ٹھیک ٹھیک لکھا ہوا ہونا چاہئے۔ اور تعلیم قرآن کیلئے یہی وہ بنیادی ضرورت تھی جو مصاحف عثمانی نے پوری کی --- یعنی ان کے ذریعے (جیسا کہ ہم بیان کرآئے ہیں۔

تمام مستند قراءات --- تلفظ کی تمام صحیح اور مستند صورتوں کو تحریر یا

Marfat.com

کتابت یعنی املاء و رسم کی حد تک لفظ کی ایک اور صرف ایک صورت کے اندر محصور کر دیا گیا --- اگر معاملہ قراءات یا تلفظ کے ہر قسم کے اختلافات کو مٹا کر ایک اور صرف ایک تلفظ یا قراءات اختیار کرنے کا ہوتا تو یہ کام --- (چاہے یہ اپنے نتائج کے لحاظ سے اختلاف مٹانے کی بجائے الٹا اختلاف کا سبب بنتا کیونکہ دینی امور میں طبائع عموماً ناجائز جبر سے بغاوت کرتی ہیں --- حضرت عثمان کی قائم کردہ کمیٹی کیلئے املاء یا رسم الخط کے اختیار میں بڑی آسانی کا باعث بنتا --- ہمیں معلوم ہے کہ اس کمیٹی کو الفاظ کے مخصوص رسم الخط اور طریق املاء کے تعین کے لئے بہت محنت اور احتیاط سے کام لینا پڑا تھا --- کہیں تو قراءات کے متعدد مگر مستند احتمالات کے مطابق مشترک رسم اختیار کیا مثلاً (ملک اور مٰلک ہر دو کیلئے) اور کہیں نسبتاً کم مستند احتمالات کو ختم کر دینے والا رسم الخط اختیار کیا مثلاً تابوۃ کی بجائے تابوت --- مصاحف عثمانی کے رسم الخط میں ملحوظ رکھے گئے اس اہتمام سے چند امور نکھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اولاً یہ کہ اس کمیٹی کے ارکان (اور دیگر تمام پڑھے لکھے صحابہؓ خصوصاً کاتبان وحی) عربی زبان کے قواعد املاء اور اصول کتابت سے کما حقہ آگاہ تھے --- محتمل قراءات الفاظ والی کی تعیین رسم کے لئے یا کسی اور معقول وجہ کی بناء پر بعض دفعہ انہیں اس زمانے کے رائج اور متعارف قواعد املاء سے ہٹ کر مخصوص املاء یا رسم الخط اختیار کرنا پڑا --- اس خلاف قاعدہ رسم الخط کے اختیار کرنے میں مہارت فن اور حکمت دینی دونوں شامل ہوتی تھیں (۲۰) ثانیاً یہ کہ کمیٹی کے یہ ارکان ہرگز اپنی من مانی نہیں کرتے تھے نہ وہ اس کے مجاز تھے اور نہ ایسا کرنا ان کے لئے ممکن ہی تھا --- خود حافظ قرآن ہوتے ہوئے بھی وہ مصحف ابی بکرؓ کو سامنے رکھ کر کام کرنے کے پابند کر دیئے گئے تھے --- ان کا کام زیادہ تر اس مصحف کی نقلیں تیار کرنا ہی تھا

ثالثاً یہ کہ اس سے مصحف ابی بکرؓ کو نئے عثمانی ایڈیشن کی اصل قرار دینے کی اہمیت اور مناسبت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ صحت کے اجتماعی اہتمام کے علاوہ باقی انفرادی مصاحف کی نسبت اس مصحف میں تعیین رسم الخط کے کام کو بھی آسان بنانے کی زیادہ صلاحیت موجود تھی۔ اس مصحف کی وجہ سے کمیٹی کا کام بڑی حد تک خود بخود آسان ہوگیا تھا کیونکہ ''رسم عثمانی'' قریباً تمام تر ''رسم صدیقی'' کی مختار صورتوں پر ہی مبنی تھا۔ اور اس بارے میں منقول اختلافات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے تک لوگوں کو اس مصحف (ابی بکرؓ) کے مختار رسم الخط کا پابند نہیں کیا گیا تھا نہ اس کی ضرورت ہی تھی۔ بلکہ مستند یا ''اجازت یافتہ'' یعنی سبعہ احرف کے اختلاف قراءات کے مطابق کتابت یا املاء اختیار کر لینے کی بھی اجازت موجود تھی۔ اور دراصل یہی ''اجازت'' ختم کرنے کی ضرورت ہی تو حضرت عثمانؓ کے زمانے میں محسوس ہوئی تھی جس کی وجوہات پہلے بیان ہوچکی ہیں --- اس طرح مصاحف عثمانی کے ذریعے قرآن کریم کی درست قراءات کیلئے درست تحریر کی ایک معیاری صورت بھی متعین کردی گئی اور سب کو اس کا پابند بھی کر دیا گیا --- یعنی ٹھیک ٹھیک پڑھنے کیلئے لکھا ہوا متن مہیا کرنے کی بنیادی تعلیمی ضرورت بھی پوری کردی گئی --- کم علم لوگوں --- عوام --- کو ان کے فہم و علم سے ماوراء علمی اختلافات میں اُلجھنے سے بچانے کا بندوبست بھی کر دیا گیا(۲۱) اور اس کے باوجود اہل علم اور ارباب استعداد کیلئے مستند تنوع اور معتبر و مفید جہات علم و تدبر کا راستہ بھی بند نہیں کیا گیا۔

۳۸۔ کتابت، املاء، ہجا اور رسم الخط کی اس مضبوط اساس اور یکسانیت پیدا کرنے کی اس ساری احتیاط کے باوجود اختلافِ قراءات اور متنوع تلفظ کا

Marfat.com

دروازہ یکسر بند نہیں ہوا --- اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ یہ بات مصاحف عثمانی کا مقصود بھی نہ تھی --- البتہ اس سے اختلاف قراءات کا دائرہ محدود ہوگیا اور اختلاف کے جواز یا عدم جواز کی بنیادی حدود متعین ہوگئیں --- مصاحف عثمانی کی اشاعت کے بعد اختلاف قراءات کے امکان و اسباب اور اس کے درجہ خطا و صواب کی پوزیشن یوں ہوگئی۔

(۱) ایسی قراءات جو رسم عثمانی سے بالکل مختلف ہوتی۔ یعنی لفظ اور اس کے حروف ہی بالکل بدل جاتے یا کوئی حذف یا اضافہ واقع ہوتا --- یا لفظ کی املاء میں جزوی تغیر لازم آتا --- ایسی ''قراءات'' کا قرآن میں لکھنا تو یکسر ممنوع قرار دیا گیا --- البتہ اگر کوئی آدمی اپنی ذاتی سند کی بنا پر اسے درست سمجھتا اور پڑھتا تو اسے بالکل گردن زدنی بھی قرار نہیں دیا گیا۔ کیونکہ اس قسم کے اختلاف کی توجیہ بھی ہوسکتی تھی --- مثلاً یہ کہ کسی سننے والے نے کسی توضیحی لفظ کو قرآن سمجھ لیا۔ یا کسی صحابی نے اپنے مصحف میں کوئی تفسیری لفظ لکھا تھا اس کے تلامذہ نے قرآنی لفظ قرار دے لیا۔ اس صورت میں ''قراءات'' تغیر الفاظ میں مد ہوسکتی تھی۔ اور اس کا قرآن نہ ہونا بھی حفظ کے تواتر سے ثابت ہو جاتا تھا --- اس لئے ایسی ازروئے تواتر مردود تمام ''قراءات'' کو قطعی قرآنی لفظ کا درجہ دے کر اُمت کو اس کا پابند کرنے سے روک دیا گیا۔

(۲) ایسی قراءات جو مصاحف عثمانی کو املاء اور رسم الخط پر ہی مبنی ہوتی مگر اختلاف کی وجہ ان مصاحف کا اس وقت تک اور کئی برس بعد تک، نقط و اعجام سے خالی ہونا ہوتا۔ اس قسم کے اختلاف کی چند صورتیں ممکن تھیں۔

(أ) لفظ کو اس طرح پڑھنا کہ عربی زبان میں اس سے کچھ معنی ہی نہ بن سکیں یا معنوں میں نہایت قبیح تغیر واقع ہوتا ہو --- ظاہر ہے اسے قراءات

Marfat.com

بمعنی ''پڑھنا'' تو کہہ سکتے ہیں مگر قراء ات بمعنی ''قرآنی لفظ'' سمجھ کر ''قراء ات'' کہنا ہی نادرست تھا۔ اور اس کے مرتکب زیادہ تر غیر عرب ہوتے تھے۔ جنہیں استاد کی بتائی ہوئی درست ''صورت تلفظ'' تو شاید یاد نہ رہتی اور صرف مکتوب لفظ کے تمام حروف کے صحیح یا غلط تلفظ کو قراء ات کا تقاضا سمجھ لیتے۔ یہ اس قسم کی غلطی تھی جس کے مرتکب ہمارے اکثر ناظرہ خواں (باوجود ضبطِ حروف کے) ہوتے رہتے ہیں۔ --- بلکہ اسی قسم کی شنیع غلطیوں کے تدارک کیلئے ہی مصاحف عثمانی کی اشاعت سے پچاس برس کے اندر، الفاظ کی صحیح قراء ات کو ضبط کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس ضرورت کے تحت ہی نقط و اعجام اور شکل و حرکات یعنی ضبط کے اصول وضع کئے گئے اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

(ب) لفظ کو اس طرح پڑھنا کی عبارت کے معنوں میں بھی کوئی قبیح خلل نہ پڑتا --- یعنی عربیت کے لحاظ سے وہ صحیح فقرہ یا صحیح و بامعنی عبارت ہی بنتی مگر لفظ یا ''قراء ات'' کی یہ صورت یا تو مطلقاً کسی بھی سند سے "حسن الرسولؐ" ثابت نہ ہوتی یا تواتر اور شہر سے ثابت نہ ہوتی۔ اس قسم کی قراء ات کو ان کی سند کے ضعف یا قوت کے پیش نظر مقبول اور مردود کے مختلف مدارج میں تقسیم کیا جا سکتا تھا۔ ایسی قراء ات کی لغوی یا نحوی یا تفسیری افادیت کی بنا پر ان سے بحث اور استدلال میں کام تو لیا جا سکتا تھا۔ مگر تواتر سے محروم ہونے کی بنا پر انہیں بھی ''قرآن'' ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا۔

(ج) لفظ کو ایک یا ایک سے زائد ایسی قراء ات یا تلفظ میں ادا کرنا جو بسند متواتر مروی ہو اور جس کی قرآنیت پر کبھی کسی کو شبہ نہ ہو سکتا ہو --- اور دراصل صحیح قراء ات کی یہی صورت تھی۔ اور اس دائرے کے اندر اختلاف قراءت جائز اور درست تھا --- اور اختلافِ قراء ات کو اسی حد کے اندر محدود

رکھنے کی تعلیم کیلئے ہی حضرت عثمانؓ نے مصاحف عثمانی کے ساتھ قراء بھیجے تھے(۲۰) --- اور اسی لئے یہ اختلاف آج تک درست قرار دیا جاتا ہے بلکہ فن قراءت اور علم تجوید کا موضوع یہی ہے۔

Marfat.com

حواشی

۱۔ دشمنانِ اسلام تو خیر حفاظت قرآن کو ''مشکوک'' ثابت کرنے کے لیے ان ہی حقائق کے صریح انکار، (رکیک تاویلات یا بعض غلط روایات کا آسرا لینے پر مجبور تھے ہی۔ بعض اپنوں کو بھی حمایت قرآن کے جوش میں نقل صحیح کے مضبوط موقف پر قائم رہنے کا ہوش نہ رہا۔ پھر انھیں ایسے نئے ''حقائق'' تراشنے پڑے جس کا ساتھ نہ عقل دے نہ نقل۔ ایسے نادان دوستوں کے موقف کے بارے میں آگے چل کر کچھ لکھا جائے گا۔

۲۔ حفاظ تو خیر جانتے ہیں شاید غیر حافظ حضرات کے لیے یہ وضاحت مفید ہو۔ دور کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دو یا زیادہ آدمی مل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پہلے ایک قرآن کریم کا کوئی مقرر حصہ (عموماً ایک رکوع) پڑھتا ہے، دوسرے سنتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرا آدمی وہ سنا ہوا حصہ بھی پڑھتا ہے اور کچھ حصہ (مثلاً رکوع) مزید پڑھتا ہے اگر تین آدمی ہوں تو تیسرا اپنی باری پر پہلے دو رکوع بھی پڑھے گا اور ایک زائد بھی۔ (اس طرح جتنے آدمی ہوں پڑھنے اور سننے والے حصے کی مقدار بڑھتی جائے گی) اس کے بعد پھر پہلا آدمی اپنے پہلے پڑھے ہوئے حصے کو چھوڑ کر باقی سب کے سنے ہوئے رکوع بھی پڑھے گا اور ایک زائد بھی۔ گویا جتنے دور کرنے والے ہوں ہر ایک کو اتنی دفعہ قرآن کریم کا مقرر حصہ پڑھنے اور سننے کا موقع ملے گا۔

۳۔ ''چالیس روز میں قرآن ختم'' قسم کے کورس اسی لیے مفید کی بجائے مضر ثابت ہوتے ہیں اور کوئی واقف قرآن ایسے کورسوں کی حمایت نہیں کرسکتا۔

۴۔ ''سبعہ احرف'' کی بحث نہایت اہم موضوع ہے۔ بات چل ہی پڑی ہے۔ ان شاء اللہ

تعالیٰ اس پر بھی ایک واضح موقف پر مبنی مضمون پیش کیا جائے گا۔ اگرچہ یہ مضمون عوامی موضوع نہیں ہے اور اسی لیے اپنوں اور غیروں کی افراط و تفریط کا ہدف بنا ہے۔

۵۔ اس کی تفصیل ایک مستقل مضمون ''قرآن اور مستشرقین'' کی محتاج ہے وباللہ التوفیق۔

۶۔ عجیب بات ہے کہ بعض حضرات کو حضرت زید کے ''رجل شاب'' (بالفاظ ابی بکر صدیق) ہونے میں اور ان کو سونپے گئے کام میں کوئی مناسبت ہی نظر نہیں آتی۔ کیا یہ کام محنت طلب نہ تھا؟ کیا واقعی محنت اور طاقت میں کوئی تعلق اور مناسبت نہیں ہے؟

۷۔ تیرہ سو سال سے ان کے قواعد املاء اور طرز ہجا کی ہو بہو نقل متن قرآن کی صحت کا معیار چلا آرہا ہے۔ ان کی اس کتابت کا ذکر آگے عہد عثمانی میں آئے گا۔

۸۔ حضرت زید بن ثابت کے حالات میں یہ امر بھی قابل ذکر ہیں۔ ان کی ولادت مدینہ میں ہوئی لیکن ان کی پرورش (چھ سال کی عمر میں والد کی وفات کے بعد) مکہ میں ہوئی۔ یہ مکہ ہی میں اسلام قبول کر چکے تھے۔ ہجرت کے وقت گیارہ سال کے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پندرہ دن پہلے یا بعد مکے سے ہجرت کر کے مدینے آئے تھے۔ جنگ یمامہ میں انہیں بھی تیر لگا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے ان سے بڑا کام لینا تھا، بچ گئے۔ کتب احادیث میں ان سے ۱۹۲ احادیث مروی ہیں۔ وفات ۴۵ھ میں ہوئی۔

۹۔ عام الوفود میں جب عرب کے کونے کونے سے قبائل کے نمائندے اسلام قبول کرنے کے لیے مدینہ منورہ آتے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر ایک قبیلے کے وفود کے ساتھ خود انہیں کے لہجہ اور محاورہ میں ہو بہو انہی کی طرح بات فرماتے۔ اس پر حضرت علی اور بعض صحابہ آپ کی اس قادر الکلامی پر تعجب کا اظہار کیا اور عرض کیا ہم تو ایسی نہیں کر سکتے تو حضور نے فرمایا [illegible] یہ سب مجھے سکھایا گیا ہے۔ میری پرورش بھی بنو سعد میں ہوئی تھی۔

۱۰۔ قرون میں یوں بھی اہل علم کم ہوتے تھے لیکن [illegible] بولیوں کے لحاظ سے بھی فرق ایک

متنوع اجتماع ہوتا ہے۔ لاعلمی میں تنوع سے اختلاف اور اختلاف سے نزاع پیدا ہونا بہت زیادہ قرین قیاس ہے۔

۱۱۔ اس وقت تک الفاظ حروف کے نقاط اور حرکات سے عاری ہوتے تھے۔ اس میں یہ صورت اختیار کی جاسکتی تھی مثلاً لفظ ''قل'' جسے بعض جگہ قال اور قل دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے یا لفظ ''مالک'' جسے سورۂ فاتحہ میں مالک اور ملک دونوں طرح پڑھنا ثابت ہے۔

۱۲۔ مثلاً لفظ ''تابوت'' مصحف صدیقی میں ''تابوۃ'' لکھا گیا تھا۔ وقف کی صورت میں قریش اسے ''تابوت'' مگر دوسرے لوگ ''تابوہ'' بولتے تھے۔ اس کیلئے ''تابوت'' کو رسم الخط اختیار کیا گیا کہ یہ وقف و وصل دونوں صورتوں میں لہجہ قریش کے مطابق تھا۔

۱۳۔ ؟؟

۱۴۔ بعض روایات کے مطابق مصحف عثمانی کی تدوین والی کمیٹی کے ارکان کی تعداد دس بارہ تک بیان ہوئی ہے۔ ممکن ہے قراء حضرات بھی ان میں شامل ہوں جو املاء اور تلفظ کے درست تعلق سے اچھی طرح آگاہ تھے اور اس طرح نئے ایڈیشن کو پڑھانے میں ایک ماہر معلم کا درجہ رکھتے تھے۔

۱۵۔ ایک آدھ روایت سے بظاہر تاثر ملتا ہے کہ شاید موجودہ ترتیب سور حضرت عثمانؓ کے وقت میں اجتہادی طور پر اختیار کی گئی۔ بفرض تسلیم بھی اس سے حفاظتِ متنِ قرآن پر کوئی حرف نہیں آتا۔ تاہم یہ بات عقلاً نقلاً ناقابلِ تسلیم ہے۔ اس کے لیے علوم القرآن پر تمام اچھی کتابوں میں مدلل بحثیں موجود ہیں۔

۱۵۔ عہد عثمانی کے بعد سے آج تک ہر جگہ اور ہمیشہ خصوصاً دورِ طباعت میں ''اغلاط سے مبرا'' نسخہ قرآن کی کتابت اور اشاعت کا اہتمام ایک بنیادی دینی فریضہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ مصحف عثمانیہ اس سمت میں پہلا پیشوایانہ اقدام تھا مابعد دور میں اس اہتمام کا کچھ

ذکر آگے دور طباعت میں آئے گا۔

۱۶۔ حضرت ابی ابن کعبؓ کی وفات ۳۰ھ میں (مصاحف عثمانی کی اشاعت سے پہلے) ہو چکی تھی مگر ان کے مصحف سے کئی مصاحف خصوصاً شام میں شائع ہو گئے تھے۔

۱۷۔ مصاحف عثمانی میں گنتی کے چند ایک باہمی اختلافات پر بھی مزید بحث آگے آتی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس قسم کے اختلاف رسم پر مبنی اختلاف قراءات کیلئے مصاحف عثمانی میں ایک ہی نسخے میں ایک قراءت متن کے اندر اور دوسری حاشیہ پر لکھنے سے پرہیز کیا گیا۔ اس سے تصحیح کا شبہ ہو سکتا تھا۔ مصاحف عثمانی کی پشت پر اسی قوت تواتر اور اہتمام صحت کا نتیجہ تھا کہ ان کے باہمی اختلافات بھی یکساں مستند قرار دیئے گئے۔ ان میں سے کسی ایک کی ترجیح سہولت قراءت کیلئے اختیار کی جاتی ہے دوسرے کے رد و انکار کیلئے نہیں۔ قراء کے علاوہ عام حضرات کیلئے یہ بات شاید خلجان کا موجب ہو۔ اس لئے مزید بحث آگے آ رہی ہے۔

۱۸۔ یہی بات حضرت عثمانؓ نے خود اپنے آخری ایام میں بلوائیوں کے سامنے کہی تھی جو حضرات ہماری بحث اور مضمون کے ختم ہونے سے پہلے (کہ مضمون بڑی سست روی کے ساتھ اقساط میں آ رہا ہے) اس موضوع پر مزید پڑھنا چاہتے ہوں ان سے الدکتور عبداللہ دراز کی کتاب "المدخل الی القرآن الکریم" کے ص [illegible] کا مطالعہ کرنے کی درخواست کی جاتی ہے۔

۱۹۔ جیسا کہ ناواقفی یا بددیانتی کی بنا پر جیفری نے اپنے مقدمے کے شروع میں لکھا ہے۔ جیفری کے مغالطوں پر مزید بحث آخر پر آتی ہے۔

۲۰۔ بعد میں عربی زبان کے املاء و نحو کے قواعد میں مزید علمی ارتقاء ہوا تو آج بعض لوگ اس طرح خلاف قاعدہ اور غیر متعارف املاء کے ساتھ لکھے جانے والے الفاظ کی صحت سے ناواقفیت کی بنا پر بعض اہل علم نے جن میں ابن خلدون جیسا نامور مؤرخ بھی

شامل ہے --- یہ نظریہ پیش کیا کہ صحابہؓ کے زمانے تک عربی زبان کی کتابت و املاء کے قواعد بالکل مبتدیانہ تھے اس لئے وہ بعض الفاظ کو ''غلط املاء'' کی ساتھ لکھتے رہے۔ قرآن کریم میں بلحاظ رسم ایسے خلاف قاعدہ الفاظ کی حکمتوں سے قطع نظر یہ حقیقت بھی اس نظریہ کی تردید کیلئے کافی ہے کہ اپنے سارے ارتقاء کے باوجود آج بھی عربی زبان میں متعدد الفاظ کے خلاف قاعدہ املاء موجود ہے مگر اسے چودہ سو سال سے رائج چلے آنے کی سند حاصل ہے، اس لئے ایسے الفاظ کو قواعد کے مطابق لکھنے کی کوشش غلطی شمار ہوتی ہے --- قرآن کریم کے اس مخصوص رسم الخط میں پوشیدہ حکمتوں پر مختلف کتابوں میں اس قدر مواد موجود ہے کہ یہ ایک مستقل تالیف کا موضوع بن سکتا ہے۔ علامہ تمنا عمادی (کی انتہا، پسندانہ اور مغالطہ آمیز آراء سے شدید اختلاف کے باوجود اس موضوع پر ان کی کتاب اعجاز القرآن کے ص ۶۰، ۵۶ کے پڑھنے کی دعوت دی جاسکتی ہے۔

۲۰۔ برسبیل تذکرہ یہاں یہ بیان کرنا بے محل نہیں ہوگا کہ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر و خیال میں اختلافی مسائل میں شدت، اور اختلاف سے بڑھ کر مخالفت، کا رنگ پیدا کرنے میں ان طالع آزما انشا پردازوں اور عوامی تقریر بازوں کا بڑا دخل ہے جو علمی مجالس سے مختص کلامی اور علمی مسائل کو پبلک جلسوں میں اور صحافت کے چوراہے پر موضوع بحث بنا کر کم علم عوام کے جذبات کا استحصال کرتے ہیں۔

۲۱۔ پوری اُمت کو ازسرنو ''نیا قرآن'' پڑھانے کیلئے نہیں بھیجے تھے --- اور نہ ایسا ممکن ہی تھا۔

Marfat.com

کتابتِ مصاحف میں علاماتِ ضبط کا تنوع

مختصر تاریخی اور تقابلی جائزہ

قرآن کریم کی درست کتابت اور صحیح قراءت کے لیے تین امور کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ رسم، ضبط اور وقف۔ ان تین اصطلاحات سے ہماری مراد علی الترتیب رسم عثمانی، علامات و اصطلاحات ضبط اور رموز وقف (جنہیں عموماً ہمارے ہاں رموز اوقاف بھی کہتے) ہیں۔ ان میں سے رسم عثمانی اور رموز وقف کے بارے میں مفصل اصول و قواعد پر مشتمل مستقل تالیفات موجود ہیں۔ مگر علامات ضبط کی صرف ابتداء کے بارے میں مجمل سا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے۔ ان علامات میں نئی نئی اصطلاحات اور کتابت مصاحف میں ان کے طریق استعمال کی تفصیلات پر کوئی کتاب، ہمارے ناقص علم کے مطابق موجود نہیں ہے اور جو کتاب ہے بھی مثلاً الدانی (ابوعمرو سعید بن عثمان) کی کتاب النقط والشکل (جو المقنع کے ساتھ چھپی ہے) اور المحکم فی نقط المصاحف (جو حکومت شام نے شائع کیا ہے) وہ بے شک اپنے مضمون پر نہایت مفصل، مدلل اور جامع مباحث پر مبنی ہیں۔ تاہم ان کا تعلق صرف ان علامات ضبط سے ہے جو نقط (جس کی وضاحت آگے آرہی ہے) پر مبنی تھیں اور جو [illegible] یہاں سے متروک ہو چکی ہیں۔

Marfat.com

اس ''نقط'' یا ''نظامِ نقاط'' کی جگہ لینے والے موجودہ ''نظامِ حرکات و سکنات'' پر مبنی علاماتِ ضبط کے بنیادی اصول و ضوابط اگرچہ یکساں ہی تھے، تاہم تجوید و قرأت کے تقاضوں کے پیشِ نظر اصل رسم عثمانی کو برقرار رکھتے ہوئے، ان علامات ضبط میں مزید ترمیم و اصلاح کا سلسلہ جاری رہا۔ خط عربی کی مختلف جمیل اقلام اور اقسام کی طرح مختلف ممالک میں مختلف قسم کی علامات ضبط رواج پا گئیں۔

کتابت مصاحف میں علامات ضبط کے اس تنوع میں مفید اصلاحات کے ساتھ ساتھ غیر ذمہ دار خطاطوں کی غفلت اور تن آسانی کو بھی خاصہ دخل رہا ہے۔ اس لیے اس تنوع اور اختلاف میں صحیح اور غلط کی تمیز کرنا بھی ضروری ہے۔ کچھ اصلاحات دورِ طباعت کے تقاضوں کی بناپر ناگزیر تھیں۔ مثلاً مصاحفِ عثمانیہ میں متروک الکتابت حروف جو قرات میں واجب النطق تھے، یہ حروف قلمی کتابت کے دور میں سرخ سیاہی سے اصل قلم کتابت کے قط کے برابر حجم کے لکھ دیے جاتے تھے۔ مگر دورِ طباعت میں سیاہی کا تنوع برقرار نہ رکھ سکنے کے باعث انہیں باریک قلم سے لکھنا اختیار کیا گیا مثلاً داود میں چھوٹی دوسری واؤ(ا) (خیال رہے صرف عرب اور افریقی ممالک کے مصاحف میں اس طرح لکھا جاتا ہے۔ برصغیر میں اسے داود.....واؤ پر اُلٹی پیش لگا کر لکھتے ہیں) قلمی مصاحف میں بعض علامات اور اشارات کو متن کی کالی سیاہی سے مختلف رنگوں کی (عموماً سرخ) سیاہی کے ساتھ لکھنا آسان تھا۔ مگر طباعت کے لیے کتابت میں ایسا کرنا نہ آسان ہے نہ سستا ہے۔

اس طرح علامات ضبط میں اصلاحات کا سلسلہ جاری رہا اور اب بھی جاری ہے۔ عرب ممالک میں جہاں رسم عثمانی کی وجہ سے قرآن کریم کی تعلیم اور

Marfat.com

قرات میں دقت پیش آرہی ہے (عربی ممالک میں تعلیم اک تناسب بڑھنے سے اخبارات، رسائل، اور کتابوں کی اشاعت عام ہورہی ہے۔ ان سب میں مستعمل رسم الخط ...... قرآنی رسم الخط میں بہت سے امور میں مختلف ہے۔ ایک عرب جب ہر جگہ مثلاً لفظ اِیای، الان یا اللیل پڑھتا ہے مگر قرآن کریم میں وہ ان ہی کو اِیَّ، الـٰن اور الیل لکھا ہوا دیکھتا ہے۔ تو وہ چکرا جاتا ہے۔ غیر عرب ممالک کے لیے رسم الخط عثمانی کسی پریشانی کا ہرگز موجب نہیں بن سکتا کیونکہ وہاں ناظرہ قرآن خوانی اسی رسم الخط کو ملحوظ رکھ کر سکھائی جاتی ہے) البتہ عرب ممالک میں رسم الخط کی یہ ''دوئی'' ایک مسئلہ ہے)۔ اور جس کی وجہ سے بعض انتہا پسند اور غیر دانش مند عرب متجددین کتابت مصاحف میں ''رسم عثمانی'' کے التزام پر تنقید کرتے اور اسے ترک کر دینے کے مشورے دینے لگے ہیں، وہاں احتیاط و اعتدال سے کام لینے والے اہل علم اس مشکل کے حل کے لیے علامات ضبط میں بعض مزید اصلاحات کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں (۲)۔ ان نام نہاد روشن خیال متجددین کے مقابلے پر دوسری انتہا پر کچھ ایسے بزعم خود غالی ''علماء'' بھی ہیں جو اپنے ملک میں رائج علامات ضبط کو بھی خط قرآنی بلکہ رسم عثمانی ہی کا جزو لا یتجزی سمجھتے ہیں اور ایسے تمام مصاحف کی کتابت کو غلط قرار دیتے ہیں جن میں ان کی جانی پہچانی، یعنی صرف اپنے علاقے میں مستعمل علامات ضبط استعمال نہ کی گئی ہوں (اس کی ایک مثال امریکہ سے MSA (اسلامی جمعیت طلبہ کا دوسرا نام) کے زیر اہتمام شائع ہونے والا عبداللہ یوسف علی کا انگریزی ترجمہ قرآن ہے۔ حقوق طبع کی بحث سے قطع نظر اس ایڈیشن میں شیخ اشرف۔ لاہور (اصل ناشر) کی کرائی گئی پیر عبدالحمید کی (پاکستانی) کتابت کو ہٹا کر اس کی جگہ عرب ممالک کے کسی نسخہ کی آیات کے آفسٹ فوٹو استعمال کیے گئے ہیں

حالانکہ اصل کتابت میں بالعموم عربی سطر کے سامنے انگریزی سطر کا التزام کیا گیا تھا جو اس جدید ترتیب میں نظر انداز کرنی پڑی ہے۔ اب صرف آیت کے سامنے آیت ہے۔ آخر امریکہ میں صرف عرب ہی تو اس ترجمہ کے پڑھنے والے نہیں تھے۔ برصغیر کے سینکڑوں ہزاروں مسلمان بھی امریکہ میں رہتے ہیں۔ ان کے لیے عرب ممالک میں رائج علامات ضبط کا سمجھنا نہایت دشوار ہے اور وہ محض اس تبدیلی خط کی بناء پر بعض دفعہ قرات میں غلطی کر سکتے ہیں اور فی الواقع کر جاتے ہیں۔ مگر MSA نے صرف کسی یا بعض عرب ممالک سے اشاعت ترجمہ قرآن کے نام پر کثیر مالی امداد حاصل کی جو غالباً اس تبدیلی کے ساتھ مشروط قرار دے دی گئی۔

اس قسم کے اسباب کی بناپر کتابت مصاحف میں علامات ضبط کے تنوع اور اسکی تاریخ کا مطالعہ ایک مفید علمی قرآنی خدمت ہے۔ کیونکہ دوسری صدی ہجری کے نصف آخر سے اب تک، علامات ضبط میں رونما ہونے والے ارتقاء اور ان علامات میں داخل ہونے والی مفید اصلاحات .....یا کسی کا تبانہ فروگزاشت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے علاقائی اختلافات وغیرہ کے تاریخی اور تقابلی تنقیدی جائزہ پر مبنی ایک نئی "المحکم فی ضبط المصاحف" کی قسم کی تالیف کے لیے کسی نئے "الدانی" کی ضرورت ہے۔ جو فی زمانا کوئی ادارہ ہی ہو سکتا ہے۔ .....بہرحال بارش کے پہلے قطرے کی سی جسارت سے کام لیتے ہوئے، اس دلچسپ داستان کا کچھ حصہ بلکہ شاید غیر مربوط سا خاکہ، جو راقم الحروف کے ناقص علم اور محدود مشاہدہ و مطالعہ پر مبنی ہے، قارئین کی سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ لعل اللہ یحدث بعد ذلك امرا۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ قران کریم عربی زبان میں نازل ہوا اور

Marfat.com

ابتداء ہی سے عربی زبان میں لکھا گیا۔۔۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں صحابہؓ کی بڑی تعداد نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ترتیب اور طریق تلاوت کے مطابق پورا قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور قرآن کریم کا ہر ہر لفظ نزول وحی کے جلد ہی بعد لکھ بھی لیا جاتا تھا۔ قرآن کریم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جو حضورؐ کی زندگی میں حفظ نہ کر لیا گیا ہو۔۔۔ اور لکھ نہ لیا گیا ہو۔

قرآن کریم کی یہ (عہد نبوی کی) کتابت عربی خط میں تھی۔ اس وقت تک عربی زبان کی ابجد بنیادی طور پر اور تعلیم کتابت کی حد تک صرف پندرہ (۱۵) حروف پر مشتمل تھی (یعنی ا ب ج د ر س ص ط ع ف ک ل م ہ و) جو اٹھائیس آوازوں کے لیے استعمال ہوتے تھے (۳)۔ ان پندرہ حروف میں سے اکثر کی ایک سے زائد آوازیں تھیں۔ انگریزی کے TH, C, G اور H کی طرح بلکہ بعض پانچ آوازوں تک کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ مثلاً ایک دندانہ "ٮ" ہی ب ت ث ن اور ی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ صرف چھ حروف ایسے تھے جو اپنی ایک ایک ہی آواز رکھتے تھے۔ یعنی ا ک ل م و اور ہ۔ عرب کے لکھے پڑھے لوگ اپنے علم زبان کی بنا پر مختلف حروف کی آواز پہچان لیا کرتے تھے۔۔۔ ایک عرب مثلاً لفظ "حرب" کو حسب موقع حرب یا جرب یا خرب یا ... اسی طرح بآسانی پڑھ سکتا تھا جیسے کوئی انگریزی داں حسب موقع g یا h وغیرہ کی درست آواز جان لیتا ہے یا عبارت میں Read اور Lead کی تحریر سے لفظوں کا مطلوبہ درست تلفظ سمجھ لیتا ہے۔

عہد نبوی کے بعد عہد صدیقی اور عہد عثمانی میں سرکاری اہتمام سے جو نسخے "امّ" یا ماسٹر کاپی کے طور پر تیار کیے گئے۔ ان سب کی کتابت انہی پندرہ حروف پر مبنی تھی۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں ان کے حکم سے اور ان کی خوشی

Marfat.com

نگرانی میں تیار کیے گئے (کم از کم) چھ مصاحف (قرآنی ایڈیشن) تیار کیے گئے تھے جو اُس وقت سے آج تک دنیا بھر میں موجود مصاحف (قرآنی نسخوں) کی اصل ہیں۔ قرآن کریم کا ہر نسخہ (مصحف) بنیادی رسم الخط (Spelling) کی حد تک ان چھ عثمانی نسخوں میں سے کسی ایک یا ان سے ہو بہو نقل کردہ کسی ایک نسخے کے عین مطابق ہوتا ہے اور اس معاملے میں ادنیٰ سا اختلاف (Variation) بھی اہل علم سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔(۴)

یہ بات بھی مسلمہ اور متفق علیہ ہے کہ قرآن کریم کے ان عثمانی نسخوں (مصاحف) کی کتابت بھی ان پندرہ حروف کے ساتھ ہی ہوئی تھی۔ ان میں حرکات تو درکنار متشابہ حروف کو متمیز کرنے کے لیے نقطے بھی نہیں لگائے گئے تھے..... اگرچہ عہد رسالت بلکہ قبل از ظہور رسالت بھی بعض بعض حروف پر کبھی کبھار نقطے استعمال کر لیے جاتے تھے۔ کاتبین مصاحف عثمانی نے عمداً اور دانستہ ان نسخوں (مصاحف) میں حرفوں کو نقطوں سے عاری رکھا۔ اور اس میں کچھ حکمت اور مصلحت بھی مقصود تھی۔ مثلاً کسی لفظ کو محتمل القراءتین بنانے کے لیے..... جس کی دونوں قراتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوں..... تاہم اس پر تفصیلی بحث کا ایک الگ مقام ہے۔(۵)

حضرت عثمانؓ کے ایڈیشن یا مصاحف کے قریباً چالیس برس بعد تک دنیائے اسلام میں قرآن کریم کی کتابت اسی طرح بغیر نقاط اور بغیر حرکات کے جاری رہی۔ مگر قرآن کریم کی تعلیم کے عہد رسالت سے ہی تلقی اور سماع پر مبنی ہونے کے باعث قرآن کریم ہمیشہ درست ہی پڑھا جاتا رہا۔ آج بھی غلط کتابت والے یا مبینہ اسرائیلی قرآن ایڈیشن..... حفاظ کے ہوتے ہوئے کبھی خطرہ نہیں بن سکتے۔

Marfat.com

پہلی صدی ہجری کے نصف آخر تک لاکھوں غیر عرب بھی اسلام میں داخل ہو کر قرآن بلکہ عربی زبان بھی سیکھ رہے تھے۔ کسی زبان کی تعلیم بلکہ اس کا بول چال میں استعمال تک بھی کسی آدمی کو اہل زبان کی سی مہارت عطا نہیں کرسکتا۔ عراق، شام اور مصر اس وقت تک اگرچہ بڑی حد تک عربی بولنے والے علاقے بن چکے تھے مگر عوام میں جہاں لحن کے ساتھ یعنی غلط سلط عربی بولنے کا رواج بڑھا وہاں ساتھ ہی قرآن کریم کی تلاوت میں اس غلط سلط عربی دانی کا مظاہرہ ہونے لگا۔ (آج بھی صرف دارجہ یعنی عوامی زبان بولنے والے ناخواندہ عرب تک قرآن خوانی میں ایسی غلطیاں عام کر جاتے ہیں) اہل علم کے ساتھ خود بعض مسلمان حکمرانوں کو بھی اس کا تدارک کرنے کا خیال پیدا ہوا۔۔۔۔اپنی سیاسی خود غرضیوں اور گمراہیوں کے باوجود ابھی تک حکمران قرآن کریم کی درست قرات کو نہ صرف اپنے ایمان کا بلکہ اپنے اہل زبان ہونے کا لازمہ سمجھتے تھے۔ اور قرآن کریم کو غلط پڑھنا نہ صرف سخت گناہ بلکہ عربی دانی کا عیب بھی متصور ہوتا تھا۔

ابوالاسود الدؤلی (م ۶۹ھ) باتفاق روایات تابعین میں سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے پورے مصحف (قرآن مجید) میں نقطوں کے ذریعے شکل (حرفوں کی آواز کو علامات کے ذریعے متعین کرنا) کے ایک نظام کی ابتدا کی۔(۶)

ابوالاسود کے اس کام پر آمادہ ہونے کے محرکات کی مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس کا باعث ان کا عبیداللہ ابن زیاد کا اتالیق ہونا بنا۔ ابن زیاد کو صحیح عربی بولنا سکھانے کے لیے انہوں نے عربی تحریر میں اس اصلاح کی ضرورت محسوس کی۔ دوسری روایت یہ بھی ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے خود اپنی بیٹی کو غلط عربی بولتے سنا۔ تیسری وجہ یہ بیان ہوئی ہے کہ ان کی عدالت

میں مدعی نے اپنا کیس بالکل غلط عربی میں پیش کیا..... اور چوتھی مشہور روایت یہ ہے کہ انہوں نے کسی آدمی کو سورہ التوبہ کی تیسری آیت میں ان اللّٰہ بری من المشرکین و رسولہ میں رسولہ کو جر کے ساتھ پڑھتے سنا۔(۷) ممکن ہے یہ ساری وجوہ ہی درست ہوں۔ بیان ہوا ہے کہ انہوں نے اس مقصد کے لیے تیس آدمیوں کا انٹرویو لینے کے بعد ایک نہایت درست لہجہ اور صاف تلفظ والے سمجھ دار لکھے پڑھے آدمی کا انتخاب کیا اس کے بعد اسے ایک مصحف (نسخہ قرآن) دے کر سامنے بٹھایا اور خود آہستہ آہستہ قرآن پڑھنا شروع کیا۔ شخص مذکور کو الفاظ کے تلفظ کے وقت قاری کے منہ، ہونٹوں اور زبان کی حرکات کے لیے حروف پر مختلف جگہ پر سرخ سیاہی سے ایک خاص انداز میں نقطے لگانے کی ہدایت کی۔ ایک دن یا ایک مجلس میں کیے ہوئے کام پر وہ خود نظرثانی کرتے تھے۔ یہاں تک کہ پورے قرآن مجید پر ''نقاط شکل'' لگانے کا کام مکمل ہوگیا۔(۸)

ابوالاسود کے کام کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ انہوں نے حرفوں کی آواز (حرکت) کو نقطوں سے ظاہر کیا۔

۲۔ یہ نکتے متن قرآن کی کتابت میں استعمال شدہ (کالی) سیاہی سے مختلف رنگ میں لگائے گئے بالعموم..... یا کم از کم ابتداء میں ان علامتی نقطوں کے لیے رنگ سرخ ہی استعمال کیا گیا۔

۳۔ زبر یا فتحہ کے لیے متعلقہ حرف کے اوپر ایک نقطہ زیر یا کسرہ کے لیے حرف کے نیچے ایک نقطہ، پیش یا ضمہ کے لیے حرف کے سامنے۔ یعنی آگے بائیں طرف ایک نقطہ اور تنوین کے لیے دو دو نقطے مقرر کیے گئے۔

اس بات کے باور کر لینے کی وجوہ موجود ہیں کہ ابوالاسود کو حرکات

Marfat.com

بذریعہ نقاط متعین کرنے کا خیال سریانی یا عبرانی میں مستعمل طریقہ (حرکات بذریعہ نقاط) سے پیدا ہوا ہوگا۔(۹) اس طرح ابوالاسود نے ابتدا، صرف تین حرکات (زبر زیر پیش یا فتحہ کسرہ، ضمہ) اور تنوین (دو زبر، دو زیر، دو پیش) ایجاد کیے۔ اور کتابت مصاحف میں اصلاح یا حروف کے لیے علامات ضبط مقرر کرنے کی پہلی کوشش تھی۔

حواشی

۱۔ المصحف المیسر ص ۵۱۔

۲۔ یوسف خلفیہ ص ۲۔

۳۔ یوسف خلیفہ ص ۲۔

۴۔ لنگز ص ۱۱۔

۵۔ المنجد ص ۱۲۶ قصہ ص ۵۰۔

۶۔ المقنع ص ۱۲۴۔

۷۔ الجبوری ص ۱۵۱۔

۸۔ قصہ ص ۵۲۔

۹۔ قصہ ۴۹، الجبوری ص ۱۴۸۔

Marfat.com

کتابت مصاحف میں صنائع و بدائع

اسلامی تہذیب و ثقافت کے دورِ عروج میں فنِ خطاطی نے ارتقاء کی کئی منازل طے کیں۔ خط کے بارے میں مسلمانوں کے حیرت انگیز اہتمام کے باعث خطاطی کا لطیف و باصرہ نواز فن اسلامی ثقافت کا ایک اہم ستون سمجھا جانے لگا۔

اسلامی خطاطی کے عروج و کمال کے اسباب میں قرآن مجید کا شمار سرفہرست ہوتا ہے۔ قرآن مجید یا اس کی بعض آیات کی تزیینی کتابت کا شوق اور اس کام میں سعادت حاصل کرنے کا ذوق، اس فن جمیل کے کمال کا محرک بھی تھا اور کمالِ فن کے اظہار کا بہترین ذریعہ بھی۔ مسلمانوں نے خط کی بیسیوں قسمیں (اقلام) ایجاد کیں۔ ان میں سے بعض اقسام مثلاً کوفی اور نسخ، کتابتِ مصاحف کے ساتھ ہمیشہ مخصوص رہی ہیں۔ کوئی خطاط اس وقت تک ماہرِ فن شمار نہیں ہوتا تھا جب تک وہ اپنے علاقے اور اپنے زمانے میں رائج قرآنی خطوط میں بھی مہارت حاصل نہ کر لیتا۔ ہر خطاط اس وقت تک اپنے فن کو بے کار سمجھتا تھا جب تک کہ وہ قرآن پاک کے کم از کم ایک نسخے کی کتابت نہ کر لیتا۔ عوام و خواص، حکمران، شہزادے اور شہزادیاں تک خطاطی سیکھنے اور خوش نویسی کو اپنے شرف وقار اور معاشرتی وجاہت کا لازمی حصہ سمجھتے تھے۔ خطاطی کے ساتھ قرآن مجید، مسلمانوں کے اندر ورق سازی، جدول سازی (نقشی حاشیاں بنانا) اور تجلید (جلد بندی) کی صنعتوں نیز تذہیب اور نقاشی ایسے فنون جمیلہ کے فروغ کا بھی باعث

Marfat.com

بنا۔ اپنے فنی کمال کو مصاحف کی تزئین میں صرف کرنا ہر صاحب فن کے لیے اپنی بہترین یادگار چھوڑ جانے کا ایک ذریعہ تھا۔

عام طور پر مصاحف (قرآن کے نسخوں) کی تیاری میں کاغذ، روشنائی، خط، تجلید، تذہیب اور نقاشی کی خوبیوں کے اعتبار سے نسخے کا فنی اور جمالیاتی معیار متعین کیا جاتا تھا۔ تاہم بعض ماہرین فن نے مذکورہ امور کے علاوہ مصاحف کی تیاری میں فنی ندرت اور فکری جدت کے بعض انوکھے پہلو نکالنے اور کتابت مصاحف میں لزوم مالایلزم کی بعض عجیب و غریب صورتیں اختیار کیں جو نسخے کو خاص طور پر ممتاز اور زیادہ جاذب توجہ بنا دیتی تھیں۔ اس قسم کے نسخوں کی دلچسپی اور جاذبیت نے بعض دفعہ اصحاب فن کی فنی کاوشوں کے متعلق افسانوی روایات کو بھی جنم دیا۔ مثلاً میں نے ایک سے زائد اشخاص سے یہ روایت سنی ہے کہ کسی ریاست میں قرآن مجید کا ایک نسخہ موجود تھا۔ جس کی کتابت ایسی صنعت کے ساتھ کی گئی تھی کہ اگر آپ ایک صفحے کے کسی حرف مثلاً ''و'' یا ''ق'' کے سرے پر کوئی پن وغیرہ رکھ کر سوراخ کریں تو نیچے کے تمام صفحوں پر وہ پن اسی حرف کے اسی حصے پر سے گزرے گا۔ گویا ایک صفحے پر جہاں کوئی حرف واقع ہوا ہے اس کے نیچے والے تمام صفحوں پر اسی جگہ وہی حرف واقع ہوا ہوگا۔ یہ چیز تو عقلاً محال نظر آتی ہے۔ البتہ طویل مشاہدے اور مطالعے کی بنا پر راقم الحروف نے کتابت مصاحف میں صنائع و بدائع کے استعمال کے متعلق بعض اہم معلومات جمع کی ہیں جو قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش خدمت ہیں۔

۱۔ کمال خط کے ساتھ ساتھ کتابت مصاحف میں ایک جاذب نظر ندرت کا پتا سب سے پہلے عباسی دور کے مشہور خطاط یاقوت المستعصمی کے ہاں ملتا ہے۔ مستعصمی کے فن کے متعلق کچھ لکھنا تو تحصیل حاصل ہے اور ہمارے

Marfat.com

موضوع سے خارج بھی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ سب سے پہلے مستعصمی نے کتابت مصاحف میں یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ صفحے کو گیارہ سطروں میں تقسیم کرتا تھا۔ ہر صفحے کی پہلی، چھٹی اور گیارھویں سطر تو خط ثلث میں لکھتا تھا اور سطور ۲ تا ۵ اور ۷ تا ۱۰ خط ریحان میں ہوتی تھیں۔ مستعصمی کی اس طرز کتابت کا بعد میں کئی خطاطوں نے اتباع کیا۔ اس قسم کے ایک نسخہ قرآن کی کتابت ترکی کے مشہور خطاط احمد قرہ حصاری نے ۹۴۴ھ میں مکمل کی۔ اس نسخے میں فی صفحہ ۱۳ سطریں اس طرح تھیں کہ پہلی، ساتویں اور تیرھویں سطر خط ثلث میں اور باقی سطور خط نسخ میں لکھی گئی تھیں۔ یہ نسخہ اب بھی دارالکتب مصریہ میں موجود ہے۔ بعض مطبوعہ نسخوں میں اس طرز کے اتباع کی یہ صورت بھی دیکھی گئی ہے کہ نیچے اوپر اور درمیان کی سطروں کو جلی قلم یا باقی سطور کی نسبت طویل لکھ کر ممتاز کر دیا گیا ہے۔

۲۔ قرآن مجید (اور عام کتابوں کو بھی) بالعموم مستطیل یا مربع شکل کے صفحے پر تحریر کیا جاتا ہے مگر بعض خطاط متن کے لیے صفحے کا درمیانی حصہ مسدس یا مثمن یا بیضوی شکل کا اختیار کرتے تھے۔ محمد روح اللہ لاہوری نے ۱۱۰۹ھ میں بمقام جزیرہ سقوطرہ ایک نسخہ قرآن لکھا جس میں تحریر متن کے لیے صفحہ مثمن شکل کا تھا۔ یہ قلمی نسخہ اب بھی دارالکتب مصریہ میں موجود ہے۔ مجتبائی پریس دہلی سے ۱۲۸۸ھ میں ایک نسخہ قرآن شائع ہوا تھا جس کا متن بیضوی شکل کا تھا۔ اسی مجتبائی پریس سے ۱۲۹۴ھ میں منشی ممتاز علی کا لکھا ہوا ایک نسخہ قرآن شائع ہوا جس کا متن شکل مسدس تھا۔ اسی طرح مفید عام پریس آگرہ سے ۱۳۰۹ھ میں مولوی روح اللہ کی کتابت سے ایک نسخہ قرآن طبع ہوا جس کا متن مثمن شکل میں تھا۔

۳۔ بعض دفعہ تحریر میں خوبصورتی اور جاذبیت پیدا کرنے کے لیے ایک ہی نسخے میں متعدد روشنائیوں یا ایک سے زیادہ اسالیب خط کا استعمال کیا گیا

ہے۔(۱) فقیر خانہ(اندرون بھاٹی گیٹ لاہور) میں اور لاہور کے بعض دیگر اہل ذوق کے پاس بہترین کتابت کے ایک ہی نسخہ قرآن کے کچھ متفرق اوراق موجود ہیں جن میں ابتدائی ،آخری اور درمیانی سطریں نیلے(لاجوردی) رنگ میں تحریر کی گئی ہیں اور دوسری سطور کے لیے الگ روشنائی استعمال کی گئی ہے۔(۲) ۱۰۴۰ھ میں علی بن محمد نامی ایک خطاط نے ایک نسخہ قرآن لکھا جس کے صفحات کے درمیان میں کہیں کہیں سفید حروف میں کتابت کی گئی تھی اور قلم بھی دو یعنی ثلث اور نستعلیق استعمال کیے گئے تھے۔(۳) خط بہار کے تمام نسخوں میں بالعموم اسم جلالت (للہ) سرخ روشنائی سے اور بعض نسخوں میں سنہری روشنائی سے لکھنے کا التزام کیا گیا ہے۔(۴) پٹنہ کے رائے بہادر جالان میوزیم میں عالمگیری عہد کا ایک ایسا نسخہ قرآن موجود ہے جو اول تا آخر سنہری حروف میں لکھا گیا۔(۵) مولوی محمد حسین عادلی کا تحریر کردہ ایک پنجسورہ بحروف سفید لاہور سے شائع ہوا تھا۔(۶)

۴۔ صنائع خط میں دقیق نویسی کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے ۔ بعض خطاطوں نے کم سے کم اوراق میں قرآن مجید کی کتابت کرنے کا اہتمام کیا ہے۔(۷) ہمارے زمانے میں فوٹو آفسٹ نے یہ کام آسان کر دیا ہے۔ مگر پرانے زمانے میں خطاط کی اصل تحریر ہی دقت خط کا نمونہ ہوتی تھی۔۱۱۶۰ھ میں مصطفیٰ بن محمد نامی ایک خطاط نے دس ورق میں ایک نسخہ قرآن مکمل کیا۔(۸) دارالکتب مصریہ میں کسی نامعلوم خطاط کا تحریر کردہ ایک مصحف موجود ہے جو ۳۳۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس میں اوراق مثمن شکل کے استعمال ہوئے ہیں اور چاندی کے ریال (ایک مربع انچ سے بھی کم) سائز کا ہے۔ دقت خط کی بنا پر یہ نسخہ مشکول بھی نہیں کیا گیا۔ ۱۳۱۳ھ میں تین سال کی محنت کے بعد علی آفندی لطفی

Marfat.com

نے سولہ ورق میں ایک نسخہ قرآن کی کتابت مکمل کی یہ نسخہ خدیو عباس پاشا والی
مصر کو ہدیہ پیش کیا گیا تھا اور اب بھی مکتبۃ الازہر قاہرہ میں موجود ہے۔۱۲۹۳ھ
میں مطبع حیدری بمبئی سے محمد جواد کشمیری کی کتابت سے لیتھو کی طباعت پر ایک
مکمل نسخہ قرآن شائع ہوا۔اس کا صفحہ مسدس شکل کا تھا اور مسدس کا ضلع سوا انچ
سے زائد نہ تھا۔ یہ نسخہ بھی غیر مشکول تھا اور لیتھو کی طباعت ہونے کے لحاظ سے
خطاط کے کمال فن کا شاہکار تھا۔قاچاری دور کے مشہور ایرانی خطاط زین العابدین
اشرف الکتاب کا تحریر کردہ ایک مصحف ۱۳۱۵ھ میں (غالباً) جرمنی سے شائع ہوا
تھا۔اس نسخے میں ایک جز کو دو (بالمقابل) صفحوں پر ختم کیا گیا تھا۔ اور اس طرح
مکمل قرآن مجید ساٹھ صفحوں میں تھا۔اگرچہ اس کی طباعت میں فوٹو بلاک کا دخل
بھی ہے تاہم اصل سے دقیق نویسی کے کمال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور اس
حقیقت سے بھی کہ اس نسخے کی کتابت دو سال میں مکمل ہوئی تھی۔محمد روح اللہ
لاہوری نے قرآن مجید کے دو نسخے ایسے تحریر کیے تھے جن میں سے ہر ایک صرف
تیس اوراق پر مشتمل تھا۔(۹) اس نسخے کا ذکر ابھی اسی مضمون میں ایک اور
صنعت کے ضمن میں بھی آئے گا۔اس خطاط کے والد محمد امین لاہوری نے بھی
ایک مصحف شریف تیس اوراق میں تحریر کیا تھا۔ یہ نسخہ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک
مدینہ میں روضۂ نبوی (علی صاحبہا التحیۃ والسلام) میں موجود تھا۔(۱۰) دقیق نویسی کا
ایک نمونہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی موجود ہے یہ ایک صدری ہے جس پر خفی
قلم میں مکمل قرآن مجید تحریر کیا ہوا ہے۔(۱۱) دقیق نویسی کی ایک جدید صورت
ایک ورق پر مکمل قرآن مجید کی طباعت بھی ہے۔ اگرچہ اس میں بھی فوٹو آفسٹ
کی صنعت کا دخل ہے تاہم مطبوعہ نسخے کے دیکھنے سے اصل کی کتابت میں خطاط
کی محنت کا اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے نسخوں میں سے دو بہت ہی

نسخے مصر سے شائع ہوئے ہیں۔اگرچہ ان کی طباعت جرمنی یا اٹلی میں ہوئی ہے ان میں سے ایک عبداللطیف نامی خطاط کی محنت کا نتیجہ ہے۔ یہ ۱۹۶۶ء میں المطبعۃ المصریۃ قاھرہ نے شائع کیا ہے۔ اس میں ایک ہی بڑے ورق پر ۲۴ کالم میں پورا قرآن شریف موجود ہے۔ اور اچھی بینائی کا آدمی اسے بآسانی (آئی گلاس کے بغیر) پڑھ سکتا ہے ۔اس قسم کا دوسرا یک ورقہ نسخہ قرآن ۱۳۷۰ھ میں عبدالرحمٰن مساعد نے قاھرہ سے شائع کیا ۔ اس میں ہر صفحے کو ۳۰ کالموں میں تقسیم کر کے ہر کالم میں ایک جز کی کتابت مکمل کی گئی ہے۔ یہ آئی گلاس کے بغیر پڑھا نہیں جا سکتا۔ اس قسم کی صنعت ہی میں لاکٹ قرآن مجید ذکر کیے جا سکتے ہیں ۔ اگر چہ ان کی تیاری میں خطاط سے زیادہ طابع کی کاریگری کو دخل ہوتا ہے۔

دقیق نویسی کی ایک عجیب و غریب صورت،جس کا تجربہ بعض نامور خطاطوں نے کیا ہے ، انڈے بلکہ گندم یا چاول کے دانے پر کوئی عبارت لکھنا بھی ہے۔صاف ظاہر ہے کہ اس قسم کی تحریر میں پورے قرآن کی کتابت تو محال ہے۔ تاہم جزوی طور پر قرآن کریم کی بعض سورتوں اور آیتوں کی کتابت ہی کو اس فنی کمال کے اظہار کے لیے منتخب کیا جاتا رہا ہے۔ اخبار الاول کے مصنف نے ۹۹۶ھ میں ایک عدالت میں گواہوں کی موجودگی میں چاول کا ایک ایسا دانہ دیکھنے کا ذکر کیا ہے جس پر محمد نامی کسی خطاط نے ۹۹۲ھ میں قرآن کریم کی تین سورتیں یعنی العصر، الکوثر ،اور اخلاص ہر سہ مع بسم اللہ نیز کاتب کا نام اور تاریخ ،تحریر کی ہوئی تھیں۔(۱۲) اسماعیل بن عبداللہ القاسم المعروف بابن الزملکی (متوفی ۷۸۸ھ) دقیق نویسی میں اعجوبہ روزگار شمار ہوتا تھا۔ یہ چاول پر آیۃ الکرسی لکھ لیتا تھا اور حمائلیں تو اس نے متعدد تحریر کی تھیں۔(۱۳) محمد بن مصلح الدین (متوفی

۱۰۸۰ھ) بھی چاول پر سورۃ الاخلاص لکھتا تھا۔ سید قاسم غباری (متوفی ۱۰۳۴ھ) بھی دقیق القلم تھا اور سورۃ الاخلاص چاول پر لکھ سکتا تھا(۱۴)۔ مصر کے ایک مشہور وکیل حسن آفندی عبدالجواد (جو ۱۹۳۳ء تک زندہ تھے) نے گندم کے دانے پر قرآن کریم کی تین چھوٹی سورتیں لکھی تھیں اور انڈوں پر بھی اس نے کئی عبارتیں تحریر کی تھیں(۱۵)۔ کابل کے مشہور خطاط سید داود الحسینی نے ایک انچ مربع جگہ میں ساڑھے پانچ سو الفاظ تحریر کیے تھے اور چاول کے دانے پر قرآن کریم کی بعض سورتیں اور آتیں بھی لکھی تھیں(۱۶)۔ مکہ مکرمہ کے مشہور خطاط طاہر الکردی کو بھی دقیق نویسی میں کمال حاصل تھا۔ کردی نے مرغی کے انڈے پر پورا جز ''عم'' (پ ۳۰) ماسوائے چند آخری سورتوں کے تحریر کیا تھا۔ ایک دفعہ اس نے گندم کے دانے پر سورۃ الحجر کی پانچ آیات (۴۵۔۴۹) لکھیں، ایک مرتبہ دانہ گندم پر سورۃ النمل کی دو آیات (۴۸۔۴۹) اور ایک دفعہ سورۃ قریش اور الاخلاص مع بسم اللہ تحریر کی تھیں(۱۷)۔ ہمارے ملک کے نامور خطاط حافظ محمد یوسف سدیدی نے بھی ایک بار چاول کے دانے پر سورۃ الفاتحہ تحریر کی تھی۔ یہ دانہ چاول انھوں نے چودھری محمد حسین مرحوم (والد اقبال) کو پیش کیا تھا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی چاول کے دانے پر لکھی ہوئی سورۃ الاخلاص موجود ہے(۱۸)۔ دقیق نویسی کا ایک شاہکار مصحف سید احمد خان کابلی مقیم بے پور کے پاس موجود تھا۔ اس میں پورا قرآن مجید بسم اللہ، درود شریف اور اسماے ائمہ اہل بیت کے اندر بخط غبار (خفی قلم) سات آٹھ انچ چوڑے اور نو فٹ لمبے کاغذ پر تحریر کیا گیا تھا۔ خط باریک تھا، مگر اچھی بینائی والا آدمی اسے شیشے کی مدد کے بغیر بھی پڑھ لیتا تھا۔ یہ آٹھویں صدی ہجری کا تحریر کردہ تھا مگر اس میں خطاط کا نام مذکور نہ تھا(۱۹)۔ دقیق نویسی ہی کی ایک صورت قرآن کریم کی بعض سورتوں کا بیل وغیرہ

کی شکل میں لکھنا بھی ہے۔ آج سے ستر اسی برس پہلے کے مطبوعہ مصاحف کے سرورقوں پر اس قسم کے فن کی متعدد مثالیں دیکھنے میں آ سکتی ہیں۔

۵۔ قرآن پاک کے بعض کاتبوں نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ ہر صفحہ کسی ایک آیت پر ختم ہو۔ یہ کام خاصا محنت طلب ہے۔ اس کی ایک مثال ترکی کے مشہور کاتب قرآن حافظ عثمان کے ۱۰۹۴ھ کے مکتوبہ ایک نسخہ قرآن مجید میں ملتی ہے۔ اسی نسخے سے فوٹو آفسٹ پر جرمنی سے ایک قرآن شریف رنگدار طباعت کے ساتھ شائع ہوا ہے اور بعض حضرات کے پاس اس (مطبوعہ) کے نسخے اب بھی موجود ہیں۔

۶۔ کتابت مصاحف میں بعض دفعہ ہر بسم اللہ بطرز جدید لکھنے کا التزام بھی کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں کل ۱۱۳ مرتبہ بسم اللہ شریف سورتوں کے آغاز میں لکھنی پڑتی ہے اسی طرح کاتب بسم اللہ کے ۱۱۳ ڈیزائن تیار کرتا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا ہے اس قسم کا پہلا نسخہ قرآن ۱۳۱۷ھ /۱۸۹۹ء میں مطبع مصطفائی دہلی سے شائع ہوا تھا، جس کی کتابت دہلی کے مشہور خطاط قرآن منشی ممتاز علی نزہت رقم نے کی تھی۔ اس میں منشی صاحب نے ہر بسم اللہ بطرز جدید لکھنے کی طرح ڈالی تھی۔ پھر یہ انداز خاصا مقبول ہوا اور کئی کاتبوں نے اس میدان میں اپنا اپنا کمال دکھایا۔ مثلاً ۱۳۳۵ھ میں شیخ الٰہی بخش جلال الدین نے لاہور سے عبدالرشید عادلی اور محمد حسین عادلی کی کتابت سے اسی قسم کا ایک نسخہ شائع کیا تھا۔ ۱۳۴۹ھ میں کریمی پریس لاہور سے محمد عبداللہ وارثی کا لکھا ہوا اسی صنعت والا ایک نسخہ شائع ہوا مدینہ پریس بجنور سے شیخ الہند کا جو مترجم نسخہ قرآن شائع ہوا اور جس کی کتابت نزہت رقم کے شاگرد منشی محمد قاسم لدھیانوی نے کی تھی، اس میں بھی ہر بسم اللہ بطرز نو لکھنے کا التزام کیا گیا تھا۔ اصح المطابع دہلی

Marfat.com

سے ۱۹۳۴ء میں شائع ہونے والے ''معجز نما'' قرآن مجید کے کاتب مولوی اشتیاق احمد نے بھی ہر بسم اللہ بطرز جدید لکھی تھی۔

۷۔ مسلمانوں نے جو خط ایجاد کیے ان میں سے بعض محض آرائشی مقاصد کے لیے تھے۔ یعنی کوئی ایک آدھ قطعہ شعر یا آیت وغیرہ لکھنے کے لیے اس سے کام لیا جاتا تھا۔ مثلاً خط ثلث، گلزار، طغری، وغیرہ۔ یہ خط خاصے دقت طلب ہوتے ہیں اور ان میں کسی مسلسل طویل عبارت کا لکھنا کار محال ہے تاہم بعض خطاطوں نے پورے قرآن مجید کو ایک یا ایک سے زائد آرائشی خطوں میں لکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ عبدالرحمن ابن الصائغ نے ۸۰۱ھ میں ایک نسخہ قرآن کی کتابت مکمل کی تھی۔ یہ پورا قرآن خط ثلث میں لکھا ہوا تھا۔ اور اس میں ہر صفحہ نو سطر کا تھا۔ یہ نسخہ اب بھی دارالکتب مصریہ میں محفوظ ہے۔ اس نسخے کے متعلق دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس کی کتابت صرف چھ دن میں مکمل کر لی گئی تھی (۲۰)۔ مصر کے سلطان برقوق کو ایک مصحف پیش کیا گیا جو پورے کا پورا خط ثلث میں تھا البتہ سورتوں کے نام وغیرہ خط کوفی میں لکھے گئے تھے۔ تذہیب اور نقاشی کا بے نظیر کام اس پر مستزاد تھا (۲۱)۔ صفی الدین صاحب ساکن نارنول نے ۱۹۰۹ء میں ایک مصحف بخط طغرا لکھنا شروع کیا تھا۔ التزام یہ تھا کہ ہر صفحے پر ایک آیت کا طغرا بخط ثلث بناتے تھے اور ہر طغرے کی وضع جداگانہ تھی، نیز ہر صفحے کی آرائشی بیل اور جدول وغیرہ بھی باندازِ دیگر تھی۔ دو پارے مکمل اور چند آیات کے ابتدائی نقشے وغیرہ تیار ہوئے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے تقی الدین ہلالی نے اس کی تکمیل شروع کی مگر ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں ان کا کیا حشر ہوا، آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ صفی صاحب کا انتقال ۱۹۳۰ء میں ہوا تھا (۲۲)۔ آرائشی خطوں میں لکھا جانے والا ایک

عجیب و غریب نسخہ قرآن کریم اعجاز محمدی پریس آگرہ سے ۱۳۱۳ھ میں شائع ہوا تھا۔ یہ پورا نسخہ قرآن خط گلزار میں لکھا گیا ہے اور غالباً برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ نسخے کے سرورق پر کاتب کا نام راحت حسین اور نقاش کا نام اولاد علی درج ہے۔ لاہور میں اس کا غالباً صرف ایک نسخہ بیت القرآن (پبلک لائبریری) میں موجود ہے۔ آنجہانی پروفیسر آربری (کیمبرج یونیورسٹی) نے گذشتہ برس چیسٹر بیٹی کے مجموعہ مصاحف کے متعلق The Quran illuminated کے نام سے جو کتاب شائع کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجموعہ چیسٹر بیٹی میں بھی خط گلزار میں تحریر کردہ ایک قلمی مصحف موجود ہے۔ کتاب میں اس مصحف کے ایک صفحے کا نمونہ بھی موجود ہے(۲۳)۔ مگر چیسٹر بیٹی کا یہ نسخہ آگرہ والے نسخے کے مقابلے میں فنی و جمالیاتی نقطہ نظر سے فروتر ہے۔

(۸) کتابت مصاحف میں ایک اور عجیب صنعت یہ بھی استعمال ہوئی ہے کہ ہر سطر کا آغاز حرف الف سے کیا جائے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ سب سے پہلے یہ صنعت کس خطاط کو سوجھی تھی۔ میرے مطالعے میں سب سے پہلے اس کا ذکر حافظ محمد حسین لاہوری کے مکتوبہ ایک نسخہ قرآن کے ضمن میں آیا ہے۔ ان حافظ صاحب نے تیس اوراق پر مشتمل ایک نسخہ قرآن تحریر کیا تھا جس کے ہر صفحے کی تمام سطریں ماسوائے سطر اول کے حرف الف سے شروع ہوتی تھیں۔ یہ نسخہ کم از کم ۱۹۴۰ء تک مدینہ منورہ میں روضہ نبوی (علی صاحبہا التحیۃ والسلام) میں موجود تھا۔ حافظ محمد حسین کے بیٹے حافظ محمد روح اللہ لاہوری بھی مشہور خطاط قرآن تھے۔ انھوں نے بھی اپنے والد کی طرز پر صنعت الف کے ساتھ دو مصحف تحریر کیے تھے۔ ان میں سے ایک نسخہ دارالکتب مصریہ میں موجود ہے(۲۴)۔ اس کے بعد اس قسم کا ایک نسخہ مشہور خطاط قرآن منشی محمد دین جنڈیالوی نے لکھا۔ سر سالار

Marfat.com

جنگ میوزیم (دکن) میں منشی صاحب کا مخطوطہ ایک نسخہ قرآن موجود ہے جس میں ہر صفحے کی تمام سطور ماسوائے سطر اول کے حرف الف سے شروع ہوتی ہیں(۲۵)۔ منشی محمد دین ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نسخہ قرآن ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء میں میور پریس دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس میں شروع سے آخر تک ہر سطر حرف الف سے شروع ہوتی ہے۔ شاید یہ نسخہ بعد کی تحریر ہو اور سر سالار میوزیم والا نسخہ اس سے قدیم تر ہو۔ میور پریس والے مصحف کا ایک نسخہ بیت القرآن لاہور میں بھی موجود ہے۔

(۹) کتابت مصاحف میں سب سے عجیب صنعت جو دیکھنے میں آئی ہے وہ مقابلہ حرفین یا مقابلہ سطرین کی صنعت ہے۔ یہ حیرت انگیز صنعت جب تک دیکھ نہ لی جائے بظاہر ناقابل یقین سی معلوم ہوتی ہے۔ راقم الحروف کو اس کے دو نسخے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ۱۳۲۲ھ میں گلشن ابراہیم پریس لکھنؤ سے عبداللطیف بھوپالی نے اپنا ہی تحریر کردہ نسخہ قرآن شائع کیا۔ یہ نسخہ اگرچہ طباعت وکاغذ کے لحاظ سے بالکل ناقابل اعتنا ہے، تاہم اس میں بہت قیمتی، مفید مواد جمع کیا گیا ہے۔ ترجمہ، تشریحی حاشیے، قراءت کے اصول و قواعد کے علاوہ اس نسخے میں بہت سے صنائع و بدائع کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض کا لحاظ تو کاتب صرف چند ایک مقامات پر ہی رکھ سکا ہے، مگر پورے نسخے کی قابل ذکر خوبی مقابلہ سطرین و حرفین کی صنعت ہے۔ اس میں ہر صفحے کی ۲۵ سطریں ہیں اور کتابت میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ سطر نمبر ۱ جس حرف سے شروع ہو سطر نمبر ۲۵ کا آغاز بھی اسی حرف سے ہو۔ اسی طرح سطر ۲، ۲۴، ۳_۲۳، ۴_۲۲، ۵_۲۱، ۶_۲۰، ۷_۱۹، ۸_۱۸، ۹_۱۷، ۱۰_۱۶، ۱۱_۱۵، اور سطر ۱۲، ۱۴ سے مطابق ایک ہی حرف سی شروع ہوتی ہے۔ تیرھویں (درمیانی) سطر میں کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس

صنعت ہی کو کاتب نے مختلف طریقوں سے شمار کر کے کئی صنعتیں گنوا دی ہیں۔ مثلاً یہ کہ تمام طاق سطور اور جفت سطور کے ابتدائی حروف ایک جیسے ہیں۔ بہر حال یہ صنعت عجیب و غریب اور قابل دید و داد ہے، مگر افسوس ہے کہ نسخہ کی طباعت نہایت معمولی کاغذ پر ہوئی ہے۔

اس قسم کی صنعت کا حامل ایک نسخہ قرآن ۱۳۳۷ھ میں منشی حکیم غلام محی الدین زینت رقم نے خود لکھ کر دارالمصاحف لاہور سے شائع کیا تھا۔ اس کا نام ہی ''حمائل اعجاز الصنعت'' رکھا گیا تھا۔ اس نسخے میں یہ التزام تھا کہ ہر صفحے کی ۱۱ سطریں تھیں اور سطور ۱ و ۱۱ ایک ہی حرف سے شروع ہوتی تھیں۔ اسی طرح سطور ۲ و ۱۰، ۳ و ۹، ۴ و ۸، ۵ و ۷ ایک ہی حرف سے شروع ہوتی تھیں۔ اور ہر صفحے کی سطر ۶ کا حرف آغاز اس کے مقابل والے صفحے کی درمیانی (یعنی چھٹی) سطر کے حرف آغاز کے مطابق رکھا گیا تھا۔

مزار شریف (افغانستان) میں ایک قلمی نسخہ قرآن موجود ہے جس کی کتابت آخری تیموری دور کی معلوم ہوتی ہے۔ خط و تذہیب کے لحاظ سے یہ نسخہ شاہ ایران کے حکم سے حال ہی میں شائع ہونے والے مصحف بخط نیریزی سے مشابہ ہے۔ اس نسخے میں ہر صفحہ ۱۱ سطر کا ہے اور ہر جگہ اس صنعت کا لحاظ رکھا گیا ہے جس کا ذکر ہم نے اوپر ''حمائل اعجاز الصنعت'' کے ضمن میں کیا ہے۔ اس نسخے کے چند صفحوں کے نمونے بھی ''نامہ آستان قدس'' میں شائع ہوئے ہیں جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ افغانستان والا یہ نسخہ خطاطی و آرائش کے لحاظ سے لاہور والی مطبوعہ حمائل سے برتر ہے۔ کتاب خانہ مدرسہ نواب (مشہد) میں بھی ۲۲ سطر فی صفحہ کا ایک قلمی نسخہ قرآن موجود ہے۔ اس میں صفحے کے درمیان میں دو لکیریں ڈال کر بالائی و زیریں گیارہ سطور کو الگ الگ کر دیا گیا ہے اور

Marfat.com

پھر ہر ایک ۱۱ سطری حصہ میں مندرجہ بالا صنعت حرفین و سطرین کا لحاظ رکھ کر کتابت کی گئی ہے۔(۲۶)

(۱۰) آپ چاہیں تو اس کے ساتھ لاہور میں سونے کے تاروں سے لکھے جانے والے تکمیل یافتہ نسخہ قرآن کو بھی شامل کر لیں اگرچہ اس میں خطاطی کے نقطہ نظر سے کوئی قابل ذکر چیز نہیں ہے۔

اس طرح ہمیں کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان فن کار کس طرح اپنے کمالات، وقت، محنت اور بعض اوقات دولت کو بھی قرآن مجید کے ظاہری جمال و جاذبیت کے لیے صرف کرتے رہے۔ یقیناً یہ بھی خدمت قرآن کا ایک قابل قدر پہلو ہے۔

مفتاح المراجع

۱۔ کردی "تاریخ الخط العربی و آدابہ" مصنفہ محمد طاہر بن عبدالقادر الکردی، مکتبہ الہلال (مصر، ۱۹۳۹ء)۔

۲۔ صحیفہ "صحیفہ خوشنویسان" از احتشام الدین احمد، مجلس ترقی ادب [illegible]

۳۔ خط "خط در افغانستان" از عزیز الدین وکیلی [illegible]

۴۔ ذکری "[illegible]" ([illegible]) بغداد، ۱۹۶۹ء۔

۵۔ [illegible]

۶۔ [illegible] آستان قدس [illegible] (ایران) ربیع الثانی [illegible]

حواشی

۱۔ ذکری، ص ۱۲۰۔

۲۔ کردی، ص ۱۸۶۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۷۶۔

۴۔ ایضاً ص ۱۸۸۔

۵۔ الزبیر، ص ۱۲۹۔

۶۔ کردی، ص ۱۷۶۔

۷۔ ایضاً۔

۸۔ ایضاً۔

۹۔ کردی، ص ۱۷۵۔

۱۰۔ کردی ص ۶۲۔

۱۱۔ الزبیر، ص ۱۵۳۔

۱۲۔ کردی، ص ۱۷۸۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۷۹۔

۱۴۔ ایضاً۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۷۹، ۱۸۰۔

۱۶۔ ھنر، ص ۴۹۔

Marfat.com

۱۷۔ کردی، ص ۱۸۰۔

۱۸۔ الزبیر، ص ۱۵۳۔

۱۹۔ صحیفہ، ص ۵۴۔

۲۰۔ کردی، ص ۱۷۶۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۸۶۔

۲۲۔ صحیفہ، ص ۵۴، نیز ص ۱۲۰۔

۲۳۔ لاہور میں صرف ایک بزرگ کے پاس آر بری ۱۱۱۰ یہ نسخہ موجود ہے اور زیر نظر تقابلی معلومات اسی نسخے کو سرسری دیکھنے سے حاصل ہوئی ہیں۔ موصوف نے کتاب سے حوالے کا حوالہ دینے کی اجازت نہیں دی۔

۲۴۔ کردی، ص ۳۶۲۔

۲۵۔ الزبیر، ص ۱۲۲۔

۲۶۔ نامہ، ص ص ۱۳، ۱۷۔

نوعِ انسانی کا معلم اعظم ﷺ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وحدہ والصلوۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ
اما بعد! فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ
الرحمن الرحیم ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم
یتلوا علیھم ایتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمۃ
وان کانوا من قبل لفی ضلل مبین (الجمعۃ : ۲)

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعہ کے گوشے بے شمار اور اس مطالعہ سے پندو موعظت کے تمام پہلوؤں کا استقصاء کار دشوار ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہمیشہ اور ہر جگہ مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ ہر مسلمان اپنے حال اور مستقبل کو سنوارنے کے لیے سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مطالعہ کا محتاج اور ضرورت مند ہے۔ جو مسلمان سیرت پاک کے متعلق کچھ نہیں جانتے یا وہ کم جانتے ہیں وہ کچھ مزید جاننے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ اور جو جانتے ہیں وہ دوسروں تک سیرت کا پیغام پہنچانا اپنا دینی فریضہ اور اپنی صلاحیتوں کا بہترین مصرف سمجھتے ہیں۔ مداحوں اور خادموں کی اس فوج کے ساتھ آنحضرتؐ کے حاسدوں کا ایک گروہ بھی سیرت طیبہ کے مطالعہ اور اس پر معاندانہ اظہار خیال کو اپنے دل کا بخار نکالنے کا ایک کارگر ذریعہ پاتا ہے اس طرح آنحضورؐ کی سیرت مطہرہ کے بارے میں دنیا کی مختلف زبانوں میں آج

Marfat.com

تک اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ اس کی مقدار کا علم بھی صحت تعین کے ساتھ تو فقط اس ذات کو ہے جس نے "ورفعنا لك ذكرك" کہا۔ البتہ جو بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے (اور جس کا ذکر جنرل محمود شیت خطاب نے بھی اپنے ایک مقالے میں اقوام متحدہ کے ایک جائزے کے تذکرے میں کیا ہے۔ (بحوث ص ۵۱۵) وہ یہ ہے کہ قریبا چار ہزار سال کی معلوم انسانی تاریخ میں کسی بھی اہم شخصیت کے بارے میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں لکھا گیا ہے جو حضور کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ --- اس حقیقت کے باوجود کہ سیرت کا بنیادی مواد متعین ہے اور اس میں سائنسی علوم کی طرح کسی ارتقائی تغیر وتبدل کا امکان نہیں ہے۔ اس کے باوجود سیرت پاک پر کتابوں اور تحریروں میں اس تعجب انگیز روز افزوں اضافہ کی وجہ یہ ہے کہ زاویہ ہائے نگاہ اور پیرایہ ہائے بیان کا حصر ممکن نہیں --- سیرت پاک کا جس پہلو سے بھی مطالعہ کیا جائے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس یہی پہلو باقی سب پہلوؤں سے زیادہ اہم اور نمایاں اور زیادہ دلکش ہے۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

یا بقول آخر۔

یزیدك وجهه حسنا
اذا ما زدته نظرا

اس کانفرنس کے لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے ایک پہلو یعنی "نوع انسانی کا معلم اعظم" کو موضوع بنایا۔ اس موضوع کے حوالے اور اس نقطہ نظر سے سیرت پاک کے مطالعہ اور اس پر غور و فکر کا جو مختصر موقع ملا تو تھوڑی دیر کے لئے تو یہی محسوس ہونے لگا کہ "معلم انسانیت" کی سیرت پر سے

کا سب سے نمایاں، امتیازی اور بے مثل پہلو ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ صرف چند محدود صفات اور امتیازی خصوصیات مل کر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو بے مثل ولاثانی نہیں بناتیں۔ بلکہ اللہ کا آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ہر صفت، ہر خوبی اور ہر خصوصیت میں بے مثل و یکتا ہے۔ جس طرح آنحضورؐ کا بھیجنے والا خالق ہر دوسرا، لامحدود قدرتوں کا مالک ہے، اسی طرح آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کے بیان کا دائرہ بھی محدود نہیں ہے۔ اور خصوصیات کا بیان بھی ایک کبھی ختم نہ ہونے والی داستان ہے۔ یہ تو صرف اشخاص اور ادوار کا اختلاف ہے جس کی وجہ سے کبھی کسی کو ایک خوبی نمایاں نظر آتی ہے تو کبھی دوسری اس سے بہتر دکھائی دیتی ہے۔ ورنہ بقول بوصیریؒ۔

منزہ عن شریك فی محاسنه
فجوهر الحسن فیه غیر منقسم

بہرحال ایک محدود وقت میں سیرت پاک کے ایک محدود گوشے پر اپنی استعداد کے محدود ترین زاویے سے نگاہ ڈالنے پر بھی حسب ذیل امور نکھر کر سامنے آتے ہیں:

۱۔ قرآن وسنت میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ''معلم'' ہونے کا خصوصی ذکر

۲۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمی پالیسی کے چند نمایاں پہلو۔ مثلاً:

(ا) فضیلت علم کا بیان اور ترغیب حصول علم

(ب) معلم اور متعلم کی اہمیت اور ان کے باہمی تعلق اور فرائض کی وضاحت۔

(ج) مقصد تعلم کا تعین۔

(د) دوائر تعلیم کی وضاحت اور تقسیم۔

۳۔ مراکز تعلیم یا درسگاہوں کی نوعیت اور اہمیت۔

Marfat.com

۴۔ طریق تعلیم کے کچھ بنیادی اصول۔

۵۔ اور نتائج اور ثمرات تعلیم۔

قدرے تفصیل اس اجمال کی یوں ہے:۔

i) قرآن کریم میں چار مقامات پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور بعثت کا مقصد "تعلیم کتاب وحکمت" مذکور ہوا ہے۔

دعائے ابراہیم:

ربنا وابعث فیهم رسولا منهم یتلوا علیهم ایٰتک ویعلمهم الکتب والحکمة ویزکیهم (بقرة : ۱۲۹)

ii) کما ارسلنا فیکم رسولاً منکم یتلوا علیکم ایتنا ویزکیکم ویعلمکم الکتب والحکمة ویعلمکم مالم تکونوا تعلمون (البقرة : ۱۵۱)

iii) لقد من الله علی المؤمنین اذ بعث فیهم رسولا من انفسهم یتلوا علیهم ایته ویزکیهم ویعلمهم الکتب والحکمة وان کانوامن قبل لفی ضلل مبین (ال عمران : ۱۶٤)

iv) هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیهم ایته ویزکیهم ویعلمهم الکتب والحکمة (الجمعة : ۲)

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "انما بعثت معلماً" کہہ کر اپنے لیے "معلم" کا لقب پسند فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تعلیم کا آغاز "اقرأ" سے ہوا۔ "اقرأ" ہی کے نتائج کو "سنقرئک فلا تنسی" کا تحفظ حاصل تھا۔ آپؐ پر نازل ہونے والی کتاب کی ابتدا ہی قلم اور [illegible]

Marfat.com

کے باہمی تعلق اور انسان کے نامعلوم علوم کے لئے قابل تعلیم ہونے کی حقیقت کے انکشاف سے ہوا۔

اقراء وربك الاكرم الذى علم بالقلم علم الانسان مالم يعلم (العلق ٣، ٤)

آپؐ نے علم کو اپنا ہتھیار کہا (والعلم سلاحی) اور آپؐ کا ''معلم'' ہونا ہی ''دعائے خلیل'' اور نوید مسیحا'' کا مکمل ظہور تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا تو قرآن میں مذکور ہے جس کا ابھی ذکر ہوا۔

ربنا وابعث فيهم رسولا منهم يتلوا عليهم ايتك ويعلمهم الكتب والحكمة ويزكيهم (البقرہ، ١٢٩)

اور نوید مسیحا کا ذکر یوحنا کی انجیل کے ١٦ ویں باب میں یوں ہوا ہے:

''مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے کہے گا لیکن جو کچھ کہے گا یہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمی پالیسی کے بیان میں سب سے پہلے علم کی اہمیت اور فضیلت کا درجہ آتا ہے۔ یہ موضوع وسیع بھی ہے اور تحصیل حاصل بھی۔ وسیع اس قدر کہ صرف علم کی فضیلت اور حصول علم کی ترغیب کے متعلق کتاب و سنت کی تعلیمات پر ضخیم کتابوں کے طویل ابواب کے علاوہ مستقل تالیفات بھی موجود ہیں اور تحصیل حاصل اس لئے کہ ہر پڑھا لکھا مسلمان اس موضوع پر کچھ نہ کچھ جانتا بلکہ کچھ کہہ بھی سکتا ہے۔

فضیلت علم اور ترغیب علم کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معلم

Marfat.com

اور متعلم کے مرتبہ اور باہمی تعلق اور ہر دو کے فرائض وواجبات کی طرف بھی مختلف طریقوں سے توجہ دلائی ہے۔ کہیں تعلیم کو صدقات جاریہ میں گنوایا:

(ان مایلحق المومن من عمله وحسناته بعد موته علماً علمه ونشره.....)

کہیں علماء کو انبیاء کے وارث قرار دیا:۔

(ان العلماء ورثة الانبياء ان الانبياء لم يورثوا دينار ولادرهما انما ورثوا العلم فمن اخذ به اخذ بحظ وافر)

کہیں طالب علم کے سفر کو فی سبیل اللہ فرمایا:۔

(من خرج فی طلب العلم فهو فی سبيل الله حتى يرجع)

کسی جگہ طالب علم کو ماضی کے بہت سے گناہوں کا کفارہ کہا:۔

(من طلب العلم كان كفارة لما مضى)

کہیں شیطان اور بدی کے مقابلے کے لئے عالم کی عابد پر فضیلت بیان فرمائی:۔

(فقيه واحد اشد على الشيطان من الف عابد)

کسی موقع پر معلم ومتعلم کو اجر میں شریک ٹھہرایا

(العالم والمتعلم شريكان فی الاجر)

کبھی طالب علم کی کوشش کی بھی ستائش کی اور اس میں ناکامی پر بھی ایک اجر اور کامیابی پر دہرے اجر کی بشارت دی۔

(من طلب علما فادركه كتب الله له كفلين من الاجر ومن طلب علماً فلم يدركه كتب الله له كفلاً من

الاجر)

بعض جگہوں پر طالب علمی کے زمانہ کی موت کو شہادت قرار دیا:۔

(اذجاء الموت لطالب العلم وهو على حاله مات شهيداً)

کہیں علم کے چھپانے کو جرم قابلِ سزا قرار دیا۔

(من سئل عن علم فكتمه الجمه الله بلجام من النار)

اور کبھی معلموں کو حکم دیا کہ وہ آنے والے طلبہ کو مرحبا (خوش آمدید) کہا کریں بعض صحابہ اپنے پاس طلب علم میں آنے والوں کو مرحبا کہتے اور ساتھ ہی بتاتے تھے کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے مطابق ایسا کر رہے ہیں۔

(كنا نأتى ابا سعيد (الخدرى) فيقول: مرحباً بوصية رسول الله)

(ج) مقصد تعلیم

اشاعت علم اور طلب علم کی اس شوق اور اس کے آداب کے بیان کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقصد تعلیم کے بارے میں یہ وضاحتیں فرمائی ہیں۔

۱۔ من تعلم علما لغير الله او ارادبه غير الله فليتبوأ مقعده من النار

۲۔ دوسری جگہ فرمایا

من طلب العلم ليجادى به العلماء اوليمادى به السفهاء او يصرف به وجوه الناس اليه ادخله الله النار يوم القيامه۔

۳۔ اور تیسری جگہ فرمایا:

من تعلم علما مما يبتغى به وجه اللّٰه لا يتعلمه الا ليصيب عرضا من الدنيا لم يجد عرف الجنة يوم القيامة۔

خدا کے خوف یا اس کی رضا۔ بلکہ تصور تک سے بے نیاز علوم و انظام تعلیم کے بین الاقوامی سطح پر جو بھیانک نتائج سامنے آئے ہیں۔ اس طرح محض شہرت، ریا ونمود، محض دنیاوی بڑائی یا محض دولت و جاہ کے لئے تحصیل علم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باعث عذاب ہونا بیان فرمایا۔ جب خدا، نیکی اور مخلوق خدا کی نفع رسانی کی بجائے چند گھٹیا قسم کے مقاصد ہی محرک تعلیم ہوں گے تو نتیجہ یہی ہوگا کہ یا تو ملک کا ہر اچھا تعلیم یافتہ یا ہنر مند (ڈاکٹر ہو یا انجینئر) ملک سے باہر بھاگنے کی فکر میں لگا رہے گا یا پھر علم کے نام پر جہالت جعلی ڈگریوں کی شکل میں بکنے لگے گی۔

(د) دوائر تعلیم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمی پالیسی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ علم پر کسی خاص طبقے کی اجارہ داری نہ رہے۔ اس ضمن میں اگر ہم اس تاریخی حقیقت کو سامنے رکھیں کہ اسلام سے پہلے علم اور اشاعت علم کی حالت کتنی ناگفتہ بہ تھی۔ عرب کے لوگ تو علم سے دور ہی تھے۔ یورپ میں بھی تعلیم کلیسا تک اور برصغیر میں برہمن تک محدود کر دی گئی تھی۔ قدیم مصر، ایران وغیرہ میں بھی علم عام آدمی کے لئے شجر ممنوع تھا۔ النبی الاُمی صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کو کسی نسلی یا علاقائی گروہ کی اجارہ داری نہیں بنایا۔ علم کے دروازے سب پر کھلے تھے بلکہ سب پر علم حاصل کرنا فرض قرار دیا گیا۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے نصاب تعلیم سے مفید دنیوی علوم خارج نہیں کئے گئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ دنیوی علوم ومنافع

کی تعلیم و تربیت کا تو اس معاشرے میں پھر بھی کچھ بھلا برا ایک نظام تھا۔ علوم دینیہ متعارف بھی نئے سرے سے ہو رہے تھے اور ان کی اہمیت بھی بنیادی تھی۔ اس لئے زیادہ توجہ ان پر تھی۔ دوسری زبان سیکھنے اور بعض جنگی صنائع کا علم اور ان کی تربیت حاصل کرنے کے لیے آنحضورؐ نے بعض حضرات کو خاص طور پر مامور کیا۔ زیدؓ بن ثابت نے بحکم پیغمبر سریانی یا عبرانی زبان سیکھی اور دو صحابیؓ (عروۃ بن مسعود اور غیلان بن مسلم) دبابات اور منجنیق کی صنعت سیکھنے کے لیے جرش نامی ایک جگہ پر جانے کے باعث جنگ حنین میں بھی شریک نہ ہو سکے تھے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمی پالیسی کا ایک نہایت اہم پہلو خواتین کے لیے مردوں سے الگ تعلیم کا بندوبست کرنا بھی تھا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہفتے میں ایک دن خواتین کی تعلیم اور ان کے مسائل کے جواب دینے کے لیے مختص کرلیا تھا۔ بعض خواتین کو خواتین سے لکھنا پڑھنا سیکھنے کی ہدایت کی گئی۔

(۳) مراکز تعلیم اور درسگاہوں کی نوعیت اور اہمیت:

ابتدائی مکی دور میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک پرائیویٹ چھوٹے سے گمنام کمرے کو اپنے مدرسہ اور مرکز تعلیم کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔ جسے تاریخ دار ارقم کے نام سے جانتی ہے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں حضرت عمرؓ اسلام کی دولت لے کر لوٹے تھے۔

ہجرت سے پہلے اہل مدینہ کی طلب پر مصعب بن عمیر وہاں کے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے بھیجے گئے تھے۔ اس وقت تک مدینہ میں کوئی مسجد نہیں تھی۔ غالباً حضرت معصب کسی پرائیویٹ مکان ہی کو مدرسہ کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ مدینہ پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد قبا اور پھر مسجد

Marfat.com

نبوی کی بنیاد رکھی اور مسجد کو ہی مسلمانوں کی روحانی، علمی، اجتماعی، سیاسی، غرض کہ زندگی کے تمام شعبوں کا مرکز بنا دیا تھا۔ آنحضورؐ نے مسجد کو ہی مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز قرار دیا۔ مسجد نبوی بڑا اور مرکزی ادارہ تھا جس کے ساتھ صفہ ایک اقامتی درسگاہ کی حیثیت رکھتا تھا، مسجد نبوی کے علاوہ مدینہ میں ۹ دیگر مساجد کے وجود کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان سب مساجد میں مسلمانوں کی تعلیم کا بندوبست تھا۔ خصوصاً بچوں کو اپنے پڑوس کی مسجد میں لکھنا پڑھنا سیکھنے کی سہولت بہم پہنچائی جاتی تھی۔ عربوں کی تعلیمی پسماندگی کو جلد از جلد دور کرنے کے لئے اور قرآن کریم کی بذریعہ کتابت حفاظت کی خاطر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کتابت سیکھنے کی تعلیم کو اولین فوقیت دیتے تھے۔ کتابت کی اس اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے۔ کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت جیسے پر خطر سفر میں بھی سامان کتابت ساتھ رکھنا ضروری خیال کیا تھا۔ جیسا کہ سراقہ کو لکھ کر دیئے ہوئے امان نامہ کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے۔

مسجد نبوی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن سعیدؓ بن العاص اور عبادہؓ بن الصامتؓ کو مسجد میں آنے والے طالبان علم، خصوصاً اصحاب صفہ کو لکھنا سکھانے پر مامور فرمایا۔ مسجد نبوی میں صحابہؓ نے تعلیمی حلقے بنانا سیکھنے کا رواج حضورؐ کے سامنے ہی شروع ہوگیا تھا۔ یہ حلقے آج کل کی کلاسوں کے قائم مقام تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری ایام میں یمن اور بعض دیگر علاقوں میں اپنے عامل (گورنر) بھیجے تھے۔ ان علاقے کی مساجد اور ان کے اندر واقع مدارس کا انتظام اور دیکھ بھال بھی ان عمال کے ذمے ہوتی تھی۔ بعض دفعہ انتظامی گورنر ایک آدمی ہوتا تھا اور ناظر تعلیمات اور قاضی (جج) دوسرا آدمی

Marfat.com

ہوتا تھا۔ عمرو بن حزم یمن کے انتظامی اور مالیاتی امور پر مامور تھے اور حضرت معاذ بن جبلؓ ناظم تعلیمات اور قاضی کی حیثیت سے وہاں بھیجے گئے تھے۔

چھوٹے بچوں کے لئے قریب ترین مسجد سے تعلیم کا آغاز کرنا، آنحضرتؐ کے عہد اور مابعد زمانہ میں مسلمانوں کے عام نظام تعلیم کا بنیادی ستون تھا۔ مساجد چونکہ عبادت اور طہارت کی جگہ ہیں اس لئے مسجد کے اندر بچہ خود بخود لباس اور جسم کی صفائی اور کئی دیگر اسلامی آدابِ معاشرت اور احکامِ عبادات سیکھتا چلا جاتا ہے۔ محلّہ اور گاؤں کی چھوٹی مساجد اور شہروں کی بڑی اور جامع مساجد آج بھی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے استعمال ہوسکتی ہیں اور ہونی چاہئیں۔ یا کم از کم ہر تعلیمی ادارہ کے ساتھ بلحاظ وسعت و اہمیت ایک متناسب مسجد ضرور ہونی چاہیے۔ اس پر غالباً حکومت کو ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔ صرف اس فیصلے کا اعلان کر دیا جائے تو اُمید ہے کہ ہر گاؤں محلے اور شہر کے لوگ بڑی آسانی سے اس قسم کی مسجد کی تعمیر پر آمادہ ہو جائیں گے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دُنیا بھر کے مسلمانوں کو عموماً اور پاکستانیوں کو خصوصاً اپنے نظامِ تعلیم میں آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے دو اصول اپنا ناواجب اور وقت کی اہم ضرورت ہے۔ یعنی (۱) خواتین کی تعلیم کے لیے علیحدہ انتظام (۲) اور تمام تعلیمی اداروں کے ساتھ مسجد کو لازم ملزوم سمجھنا۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا نظام تعلیم مفت اور رضاکارانہ تھا، بلکہ صفہ کے ذریعے ''مفت اقامتی اور ہمہ وقتی تعلیم'' کا آغاز بھی کر دیا گیا تھا۔ اسی مفت تعلیمی حکمت عملی کا نتیجہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مدتوں تک علماء و ائمہ تدریس و تعلیم پر اجرت لینا قطعاً حرام سمجھتے رہے اور معاش کے لیے کسی اور پیشے کو اختیار کرتے تھے۔ بہت سی پیچیدہ معاشرتی مجبوریوں کی بنا پر جب

Marfat.com

علماء مدرسوں میں تنخواہوں پر کام کرنے لگے۔ تب بھی اس کا بوجھ بلکہ بوجھ کا ادنیٰ حصہ بھی طالب علم پر نہیں ڈالا جاتا تھا طلبہ کے تمام مصارف (کتب، طعام لباس تک) مدرسہ ادا کرتا تھا چاہے وہ حکومت کی جانب سے ہوتا یا بعض اصحاب خیر کی طرف سے تعلیم پر طلبہ سے فیسیں وصول کرنے اور تعلیم و تعلم کو بھی تجارتی اصولوں پر چلانے کا رواج غالباً سب سے پہلے انگریز نے ہی ڈالا۔ اسلامی تاریخ میں اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔

(۴) طریق تعلیم کے چند بنیادی اُصول

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کو آسان، عام اور موثر و نتیجہ خیز بنانے کیلئے بعض خاص ہدایات وقتاً فوقتاً جاری فرمائیں جن کی نفسیاتی اور تعلیمی اہمیت آج بھی برقرار بلکہ زیادہ آشکار ہے۔ مثلاً آپ نے یہ حکیمانہ اصول دیا کہ:

"یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا"

آپ خود اکثر بات کو آہستہ اور دہرا کر کرتے تھے تاکہ سننے والے کو ذہن نشین اور یاد کرنا آسان ہو۔ (انه كان اذا تكلم بكلمة أعادها ثلاثا حتى تفهم عنه) آپ اس بات کا بھی خیال رکھتے تھے کہ سننے والا اکتا نہ جائے۔ عبداللہ بن مسعود سے کسی نے ہفتہ وار درس کو روزانہ یا سہ روزہ کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے کہا تھا کہ میں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کر رہا ہوں کہ

(كان النبيؐ يتخولنا مخافة السآمة علينا)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ساری قادر الکلامی کے باوصف ہمیشہ مخاطب کے فہم اور اس کے ذہنی معیار کے مطابق گفتگو فرماتے آپ کی گفتگو میں کوئی ایسی بھاری بھرکم اصطلاحات، کوئی مرموز عبارات یا خفیہ اشارات و تشبیہات

نہیں ہوتی تھیں جو سامع کے لیے فہم کلام میں آڑ بن سکتے ہیں۔ جو ہم اکثر اپنی شخصیت کا دبدبہ و رعب ڈالنے کے لیے یا اپنے علم کی اصلیت سے زیادہ نمائش کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ بعض دفعہ آپ دور سے آنے والے قبائل کے ساتھ خود ان کے مقامی لہجے کے مطابق گفتگو فرماتے تھے۔ اس سے ہمیں ابتدائی تعلیم کے مادری زبان میں ہونے کی افادیت کا اصول بھی ملتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوٹے بچوں کو گھر پر بھی نماز، طہارت اور دیگر اسلامی آداب سکھانے کے بارے میں واضح ہدایات دی ہیں۔ اس کا مقصد بچے کے گھر اور مدرسے کے ماحول میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ حضورؐ کے طریق تعلیم میں عدد اور گنتی کی مد حافظہ تدبیر کا استعمال بھی ملتا ہے مثلاً:۔

اتقوا السبع الموبقات ..... فامرهم باربع ونهاهم عن اربع .....ثلاث من كن فيه وغيره۔

اسی طرح آپ مخاطب میں تعلیم کے لیے ذہنی آمادگی پیدا کرنے کے لیے بعض دفعہ ایک مناسب اور پُرکشش سوال سے ابتدا فرماتے جس سے اس کی پوری توجہ جو آپ کی طرف منعطف ہوجاتی تھی۔ احادیث میں اتدرون، اتحبون وغیرہ کلمات سے بات کا آغاز کرنے کی متعدد مثالیں مل جاتی ہیں۔

(۵) نتائج اور ثمرات تعلیم

معلم کتاب و حکمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نظام تعلیم و تربیت اور اشاعت علم کی حکمت کے نتائج دو لحاظ سے تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ اولاً افراد سازی کے نقطہ نظر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعمیر انسانیت کا کام انسانیت کی ابتدائی سرحد سے شروع کیا اور پھر اسے انسانیت کے بلند ترین معیار تک پہنچا دیا۔ آنحضورؐ نے اپنے تلامذہ کو حیرت انگیز طور پر متضاد اوصاف و

کمالات کا جامع بنا دیا اور زندگی کے ہر میدان میں اپنی استعداد اور صلاحیت اور فرض شناسی اور احساس ذمہ داری کا ثبوت دینے والے ایسے ایسے افراد تیار فرمائے کہ ان کے کارنامے تاریخی حقائق ہونے کے باوجود شاعرانہ تخیل اور فرضی افسانوں سے زیادہ حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ ثانیاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس علم پرور نظام تعلیم کا ہی نتیجہ تھا کہ عربوں کی ناخواندگی اور امیت کے دور اور پھر ان کے دنیا بھر کے علوم و فنون کے شیدائی بن جانے کے دور کا درمیانی فاصلہ حیرت انگیز طور پر کم ہوگیا۔ تاریخ میں کہیں اس قدر سریع علمی ترقی کی مثال نہیں ملتی۔ ایک قلیل مدت کے اندر دنیا کی سیاسی ہی نہیں علمی قیادت بھی مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں آ گئی اور یہ سب برکت تھی اس ذہنی انقلاب کی جو قرآن نے مسلمانوں میں برپا کیا اور اس علمی لگن کو جو (معلم اعظم) نے اپنے متبعین کے اندر پیدا کر دی تھی۔

Marfat.com

نبی اکرمؐ اور مکارمِ اخلاق

کوئی شخص ہو یا جماعت تحریک ہو یا واقعہ اس کے مقصد اور اس کی اہمیت میں ایک ایسا تعلق ہوتا ہے کہ بعض دفعہ مقصد سے اہمیت پر استدلال کیا جاسکتا ہے اور بعض دفعہ اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کے مقاصد کی تلاش کی جاتی ہے۔سیرت کانفرنسوں ، جلسوں (جلوسوں کو چھوڑیئے) تقریروں اور مقالوں کی اہمیت کیا ہے؟ کیا یہ اہمیت مقررین حضرات کی ذاتی و جاہت اور شخصی شہرت میں پوشیدہ ہے؟ یا تقریر کے لذیذ انداز سے حاصل ہونے والی ''پاکیزہ ذہنی تفریح'' میں ..... یہ بھی ممکن ہے کہ مقرر کے لیے اس کی اہمیت کسی اور مقصد کے اعتبار سے ہو اور سامعین کے لیے کسی دوسرے سے۔ تاہم بظاہر ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ان کانفرنسوں اور تقریروں کی اہمیت اس لیے ہے کہ اپنے مقصد کے لحاظ سے یہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کے مختلف گوشے پیش کر۔کے مسلمانوں کے دل میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور نتیجتاً محبت پیدا کرنے اور عمل میں سنت کا رنگ بھرنے کی ایک کوشش ہے اور شاید محترم ڈاکٹر صاحب یہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

تا تو بیدار شوی، نالہ کشودم ورنہ
عشق کارے است کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور بعد از خدا بزرگی و فوقیت کا اقرار تو ایک مسلمان کے ایمان و یقین کی بنیاد ہے۔ اور اِس معاملے

Marfat.com

میں نکتہ ہائے دقیق سے سادہ دلانہ یقین زیادہ بہتر ہے، تاہم پیچ و تاب خرد میں بھی ایک "لذتِ دگر" ہے اور شاید یہ کانفرنسیں اور تقریریں اس پہلو سے بھی قابل توجہ ہوسکتی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور اہمیت تو تاریخ انسانی کے کسی بھی طالب علم سے نہ پوشیدہ رہ سکتی ہے، نہ رکھی جاسکتی ہے۔ سوال صرف یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ اس عظیم ترین شخصیت کا مقصد حیات کیا تھا؟ اور اس سوال کے غلط یا درست جواب پر ہی ایک غیر مسلم کے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کردینے یا آپؐ پر ایمان لانے کا دار و مدار ہے۔

یہی سوال ہمارے سامنے بحیثیت مسلمان ہونے کے یوں آتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و نبوت کا مقصد کیا تھا؟ اور اس سوال کے جواب اور اس مقصد کے تعین پر ہی ایک مسلمان کے ایمان و اسلام کے زوال یا کمال کا انحصار ہے۔

۱۔ کیا آپؐ کا مقصد محض ایک اچھی (نیک لوگوں کی) حکومت قائم کرنا تھا؟

۲۔ کیا آپؐ کا اصل کام غریب و امیر کے فرق کو مٹا دینا تھا؟

۳۔ کیا آپؐ کا بنیادی کام شفاعت کے زور پر بدکاروں اور گنہگاروں کو اللہ میاں کے "تھانے" سے چھڑا لے جانا تھا؟

۴۔ کیا آپؐ کی اصل ڈیوٹی صرف قرآن کریم دوسروں تک پہنچانے کی تھی اور بس؟

شاید یہ سب کام، بلکہ کئی اور اہم کام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد کے طور پر بیان کیے جاسکتے ہیں، کیے گئے ہیں، اور کیے جارہے ہیں۔ لیکن اپنی افتادِ طبع اور ذاتی فہم شناسی کے کمالات دکھانے کے بجائے خود اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی ہی اس مقصد بعثت کو سمجھنے اور

Marfat.com

سمجھنے کی ایک کوشش کبھی تو کر دیکھیں (ممکن ہے آپ کو یہ بھی ہماری فیل شناسی کا ہی ایک مظہر معلوم ہو) اس بندۂ ناکارہ نے اس مقصد کے لیے قرآن و حدیث کی اُن نصوص پر غور کیا جن میں آنحضورؐ کے مقصدِ نبوت و بعثت کو لامِ کے (تاکہ) کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، تو یہ باتیں سامنے آئیں:

I۔ ظلمات سے نور کی طرف نکالنا۔

i) كتاب انزلنه اليك لتخرج الناس من الظلمات الى النور (سورة ابراهيم)

ii) هو الذى ينزل على عبده ايٰت بينات ليخرجكم من الظلمت الى النور (سورة الحديد)

iii) قد انزل الله اليكم ذكرا رسولاً يتلو عليكم ايٰت الله بينات ليخرج الذين امنوا وعملوا الصلحت من الظلمت الى النور (سورة الطلاق)

iv) قابلِ غور ہے کہ ایمان و عملِ صالح والوں کو بھی ظلمات سے نور کی طرف لے جانے کا ذکر ہے۔ (ایمان و عمل صالح کے بعد بھی ظلمات کے سائے کیا ہو سکتے ہیں)

II غلبہ دین کے لیے (i) سورۃ التوبہ، سورۃ الصّف کی آیات بتکرار یا اکمال و اتمام دین کے لیے (معانی اظہار)

آنحضورؐ کے منصب رفیع اور فضائل کے سلسلے میں بہت کچھ قرآن کریم میں ہے مگر لام کے ساتھ مقصد نبوت پر روشنی ڈالنے والی آیات یہی ہیں۔ اسی طرح بعثت (میں بھیجا گیا) سے شروع ہونے والی احادیث میں سے بعض میں آپ کے فضائل یا آپ کے منصب رفیع کی جھلک بھی ملتی ہے۔ مثلاً بعثت

Marfat.com

بالحنيفية السمحة بعثت بجوامع الكلم، بعثت الى الناس كافة، بعثت انا والساعة كهاتين وغيرها..... مگر احادیث میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے لام کے (تاکہ) کے ساتھ جو مقصد بعثت بیان ہوا ہے، وہ الفاظ کے اختلاف کے باوجود ایک ہی بیان ہوا ہے۔

۱۔ بعثت لاتمم حسن الاخلاق (مشکوۃ بحوالہ موطا، مسند)

۲۔ بعثت لاتمم صالح الاخلاق (الجامع الصغير بحواله مسند، ک)

۳۔ انما بعثت لاتمم مكارم الاخلاق و محاسن الاعمال (مطالب الانبیاء بحوالہ بیهقی و مسند)

ان آیات و احادیث کو سامنے رکھیں تو ظلمات سے نور (مراحل اخیر کے بعد) رذائل کی ظلمتوں سے فضائل و مکارم کے نور کی طرف آنا بھی مراد ہوسکتا ہے، آخر ظلمات تو متعدد ہی ہیں۔ غلبہ دین والی آیات میں تو غلبہ بذریعہ تلوار (اور محض تلوار) کے علاوہ غلبہ بذریعہ فضائل و مکارم بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔ بلکہ حقیقی غلبہ وہی ہے جو سیاسی + اخلاقی ہو۔ (آیت التحریم سے استدلال) اگر لیظهره على الدين كله کے معنی پورا دین بتا دینے کے لیے جائیں تو آیت مطہرہ میں تمام مکارم کو جمع کر دینا بھی اس میں شامل ہے۔ اس طرح سے ہر لحاظ سے محاسن و مکارم اخلاق ہی آپ کی بعثت کا مقصد عظیم معلوم ہوتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے آپ کے فضائل کے ذیل میں عظمت کا لفظ صرف خلق کے ساتھ استعمال کیا ہے انک لعلى خلق عظيم اور مکارم اخلاق کو اپنی بعثت کا مقصد بتانے کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید مختلف طریقوں سے ان کی طرف توجہ دلائی۔

۱۔ مثلاً کبھی آپ نے محاسن اخلاق کی فضیلت و ترغیبات بتائی

Marfat.com

۱۔ اکمل المومنین ایمانا احسنهم خلقا۔

۲۔ البر حسن الخلق ..... علیه الناس۔

۳۔ ان من احبکم الی احسنکم اخلاقا۔

٤۔ ان من خیارکم احسنکم اخلاقاً۔

٥۔ حسن الخلق خلق اللّٰه الاعظم۔

۲۔ کبھی آپؐ نے محاسن و مکارم کے لیے دُعا کرنا سکھایا:

۱۔ اللهم انی اسئلك الصحة والعافیة والامانة و حسن الخلق۔

۲۔ اللهم اهدنی لصالح الاعمال والاخلاق فانه لا یهدی لصالحها ولا یصرف سیئها الا انت۔

۳۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ ابتدائے بعثت سے ہی آپ نے توحید ورد شرک کے ساتھ محاسن اخلاق پر زور دیا (قرآن میں بھی) ابوذر غفاری رضی اللہ تعالی عنہ نے جب اپنے بھائی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوی نبوت کے متعلق تحقیق کے لیے بھیجا تو انہوں نے واپس آ کر آپؐ کے متعلق یہ الفاظ کہے:

رأیته یامر بمکارم الخلاق.

قصہ بنت حاتم الطائی میں آپؐ نے فرمایا:

فان اباها کان یحب مکارم الاخلاق واللّٰه یحب مکارم الاخلاق۔

اہل عرب محاسن اخلاق سے یکسر ناواقف نہیں تھے، مگر یہ صفت ان میں کمیاب اور جزوی اخلاق کی حیثیت رکھتی تھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محاسنِ اخلاق کو حکم شرع و اُصولِ اسلام اور آدابِ سُنت قرار دیا۔ یہ بھی قابلِ غور ہے

Marfat.com

کہ اہل عرب عقل و دانش کی پختگی اور شرافت و اخلاق کی جامعیت کو حکمت کہتے تھے۔ اگر حکمت کے یہ معنی سامنے رکھیں تو: الکتاب والحکمۃ میں حکم کے معنی بھی واضح ہو جاتے ہیں، اور یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ مکارم اخلاق کی تعبیر خالص اسلامی ہے۔ جاہلیت کی نصوص میں محاسن کا ذکر ملتا ہے مگر کہیں مکارم کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ (لطفی جمعہ بحوالہ شیر فارس کانفرنس ۳۵۔ روما) محاسن سے مکارم کا درجہ زیادہ بلند ہے، بلکہ محاسن کے بلند تر درجے کے لیے مکارم کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اگر: ان اکرمکم عند اللہ اتقکم کو سامنے رکھا جائے تو مکارم اخلاق کے معنی بآسانی ذہن میں آسکتے ہیں۔ محاسن اخلاق کی تفصیلات سے کتب حدیث مملو ہیں۔

طریق تعلیم محاسن:

i) سوال و جواب، فقہی سوال کم (۱۳ مسائل) اخلاقی زیادہ

ii) بعض اعمال پر سرزنش۔

iii) جزئی روزمرہ کے واقعات پر ہر جگہ اخلاق کی تعلیم دینا (بلی کے واقعہ تک)

محاسن اخلاق کی اس طویل فہرست پر نظر ڈالی جائے، جو کتب حدیث میں موجود ہے تو حسن خلق کے ہمارے ہاں رائج معنوں کی غلطی بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اول تو ہمارے ہاں حسن خلق ''خوش اخلاقی'' کے معنوں میں استعمال ہوا ہے (صرف میٹھی زبان، خندہ روئی، ملنساری وغیرہ) باقی اعمال نظر انداز۔ تجارتی، سیاسی بددیانتی اور معاشرتی و تہذیبی بے دیانتی۔ یہ زندگی کو ایک کل نہ سمجھنے بلکہ تقسیم کر لینے اور تمام افکار و اعمال و احساسات کو ایک ہی محرک کے تابع نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔

Marfat.com

حسن خلق کا دوسرا مفہوم زیادہ تر مخصوص شرعی آدابِ معاشرت تک محدود سمجھا جاتا ہے، یہ بات غلط نہیں مگر اسلامی اخلاق کا یہ ایک ناقص اور ادھورا تصور ہے (ابوابِ کتب حدیث: الآداب)

محاسن کے مقابلے پر مکارم اخلاق کی تفصیل محدود ہے:

۱۔ آیت : خذالعفو وأمر بالعرف واعرض عن الجاهلين۔

i) ان جبريل نزل على النبیؐ فقال يا محمد انی اتيتك بمكارم الاخلاق فی الدنيا والآخرة خذ العفو ..... الايه

ii) قال رسول اللّٰه ادبنی ربی فاحسن تاديبی ثم امرنی بمكارم الاخلاق فقال خذ العفو ..... الايه

دیگر آیاتِ مکارم ہم معنی وہم موضوع:

i) وك تستوی الحسنة ولا السيئة ادفع بالتی هی احسن

ii) واذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما

iii) ولمن صبر و غفر ان ذلك لمن عزم الامور

حدیث کی توضیح کے مطابق مکارمِ اخلاق یہ امور ہیں:

عفوك من ظلمك ..... اعطاء ك من حرمك .....

صلتك من قطعك احسانك من اساء اليك .....

نصيحتك من غشك حلمك من اغضبك۔

اور غور کریں تو سب کی اصل وہی عفو، امر بالمعروف اور اعراض عن الجاہلین ہی ہے۔ خذ العفو والی آیت کا مکارم اخلاق پر مشتمل ہونے کا دوسرا استدلال "خلق عظیم" کے بعد والی آیات میں معاندین کے اخلاق کے ذکر سے ہوتا ہے۔ یوں مکارم اخلاق کی انتہا اپنے نفس پر قابو پانا اور اپنے ضمیر کو نفسانیت سے پاک کرنا

Marfat.com

ہے۔ اسی بات کو حضرت سید الاولیاء حضرت عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ نے مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا ہے کن مع الحق بلاخلق و کن مع الخلق بلا نفس۔ تصوف میں اکثر حب الٰہی کو منتہائے مقصود سمجھا جاتا ہے۔ حب الٰہی مکارم اخلاق کا سبب بھی ہے اور مظہر بھی (قصہ ملک بہرام) اور مکارم و محاسن اخلاق میں یہ بھی ہے کہ خود بے عمل نہ ہو۔ آج دوسری قوموں کے مقابلے پر خود مسلمانوں کی کمزوری یہی ہے کہ وہ اس نسخہ بقاء و حیات کو سینے سے لگائے خود دم توڑ رہے ہیں۔ مگر دنیا کو چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ اے لب گور دنیا! یہ تیرے پاس آب حیات نہیں زہر قاتل ہے، ادھر آؤ آب حیات ہم تمھیں پیش کر رہے ہیں اور دوسروں کو تلقین اخلاق کرتے ہیں مگر خود اپنی حالت کچھ ایسی ہے:

عالم فاضل بن گئے بھول گئے اخلاق
مثبت، منفی کٹ گئے کھاتہ ہے بے باق

Marfat.com

اِسلام کا رُوحانی نظام☆

اصل موضوع پر بات کرنے سے پہلے تین وضاحتیں ضروری معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ سب سے پہلے یہ کہ مقالہ نگار کوئی ''روحانی عامل'' نہیں اور نہ ہی موضوعِ گفتگو عملیات، تعویذ گنڈے یا ''طلسمات'' ہیں۔ یہ نظام بھی ہمارے ہاں رائج ہے اور صحیح معنوں میں ایک ''عوامی نظام'' ہے اور شکم پروری کے سامانوں میں سے ایک سامان ہے۔ اس ''روحانی دنیا'' میں جہالت اور توہم پرستی (Superstitions) کے عناصر اتنے زیادہ ہیں کہ اس قسم کے ''اعمال'' کی شرعی اصل اگر کوئی تھی بھی تو وہ تو پس منظر میں چلی گئی ہے اور ہمارا یہ نام نہاد ''روحانی نظام'' اب تو عرب جاہلیت کے کاہنوں اور یہود کے جادوگروں کی یاد دلاتا ہے۔

۲۔ دوسری وضاحت یہ ضروری ہے کہ روحانی نظام سے ہماری مراد انسان کی بعض باطنی استعدادات کی وہ تربیت بھی نہیں جسے ہپناٹزم و مسمریزم یوگا اور ٹمو وغیرہ کے نام دیئے جاتے ہیں۔ یہ چیزیں انسان کے اندر ایک غیر مادی قوت یا قوتوں کے وجود کا پتہ تو دیتی ہیں۔ یعنی انسان کی مادی یا جسمانی قوتوں سے ماوراء۔ اس کے اندر کچھ ایسی غیر مادی یا روحانی یا باطنی قوت بھی موجود ہے جس کی تربیت کی جاسکتی ہے۔

☆ حکمت قرآن، دسمبر ۱۹۸۸ء

اور اسی کے ساتھ وابستہ ہے کشف و کرامات یا ان سے ملتا جلتا وہ نظام جس کے وجود کا پتہ ہر مذہب و ملت میں ملتا ہے اور جسے قطعی معیارِ حق ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اور اگرچہ اس میں بھی دھوکے اور فراڈ کو حقیقت سے متمیز کرنا کار دشوار ہے تاہم موضوع دونوں صورتوں میں روح انسانی یا انسان کی روحانی قوت ہے۔

اسلامی روحانی نظام کی اصل غرض و غایت ''روح کا تزکیہ'' ہی ہے۔ انسان کی روحانی یا غیر مادی قوتوں کی پرورش و تربیت اور اس کی نمائش (Demonstration) اور اس کے مقابلے پر ''اسلامی تزکیہ روح'' کی مثال ایک بزرگ نے یوں دی تھی کہ آپ کسی دھات وغیرہ کی بنی ہوئی چیز کو پیشاب سے دھوکر بھی، اس کا میل اور زنگ دور کر کے اس میں ایک صیقل اور جلا (چمک) پیدا کر سکتے ہیں۔ تاہم یہ صیقل و جلا طہارت سے محروم رہے گا جب کہ اسلام میں روح کی اس صیقلگری کی بنیاد ہی ظاہری و باطنی ''طہارت'' پر ہے۔

۳۔ اس سلسلے میں تیسری وضاحت یہ ہے کہ اس مقالہ کا موضوع کوئی ''درس تصوف'' بھی نہیں ہے اور یہ اولاً تو اس لئے کہ مقالہ نگار کوئی عار محسوس کیے بغیر یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ اس ''فن'' کا مبتدی بھی نہیں۔ ثانیاً یہ بھی کہ تصوف اپنے درست معنوں میں بھی تعلیم یا محض تقریر نہیں بلکہ ایک ''تربیت'' کا نام ہے۔ اور اس کا مقام 'پبلک شو'' نہیں ہے۔ اور ثالثاً یہ بھی کہ اس معاملے میں پاکستانی مصنوعات کی طرح اصلی اور نقلی کی پہچان کار دشوار ہے۔ امام غزالیؒ کو یہ شکایت تھی کہ تصوف میں مدعی زیادہ اور کاملین یا مخلصین کم ہیں۔ اور اب تو اس وقت کی نسبت بھی ''خیر القرون'' سے قریباً ایک ہزار سال اور بھی پیچھے جا پڑے ہیں۔ اور اب تو تصوف کے

وارثوں کی حالت بھی مسلم لیگ کے وارثوں کی سی ہے۔ جن کے پاس سب سے وزنی اور جاندار نعرہ ''پدرم سلطان بود'' رہ گیا ہے۔

''روحانی نظام'' میں روح کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے بارے میں تو ہم ''الروح من امر ربی'' سے آگے کچھ نہیں جانتے۔ مگر یہ بات ظاہر ہے کہ روح اس جسد خاکی کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔ انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے۔ اور یہ بات تو اجتماعی عقل انسانی نے تسلیم کرلی ہے کہ جسم کی اپنی دنیا ہے اور روح کی اپنی دنیا ہے۔ دونوں کی اپنی اپنی ضروریات اور خواہشات ہیں۔ خود بھوکا ہوتے ہوئے اپنی روٹی کسی غریب کو دے دینے میں دکھ کی بجائے لذت کیوں محسوس ہوتی ہے؟ یہ لذت جسمانی ہے یا روحانی؟ اسی طرح جیب میں مال رکھتے ہوئے کسی معذور اور مجبور کی مدد نہ کرنا..... حالانکہ اس کی مجبوری اور معذوری کو وجود میں لانے میں ہمارا کوئی قصور نہ ہو ایسے آدمی کی۔ استطاعت کے باوجود— مدد نہ کرنا آخر (انسانی معاشرے میں) مذموم کیوں سمجھا جاتا ہے؟

الغرض جسم کی طرح روح کی بھی ضروریات، خواہشات اور استعدادت ہیں۔ اس کا ایک واضح اور بین ثبوت یہ بھی ہے کہ اگر انسان کی ساری جسمانی ضروریات پوری کر دی جائیں بلکہ تمام جسمانی آسائشیں بھی مہیا کر دی جائیں تو ضروری نہیں کہ وہ اندرونی.....روحانی اور قلبی .....امن وسکون سے بھی بہرہ ور ہو جائے۔ ہمارے دور سے زیادہ جسمانی اور مادی آسائشیں بلکہ تعیّشات غالباً تاریخ کے کسی دور میں انسان کو حاصل نہیں ہوئیں۔ لیکن بایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج نیند جیسا فطری عمل بھی گولیوں اور دواؤں کا مرہون منت بن کر رہ گیا ہے۔

بعض قوموں یا ملتوں کا خیال ہے کہ جسم اور روح کے مقتضیات اور مفادات میں ایک تضاد اور تعارض ہے اور ایک کی ترقی دوسرے کی تنزلی یا تباہی

Marfat.com

کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی نظریہ سے ایک طرف تو نری مادی لذت پرستی۔ اور دوسری طرف ترکِ لذات بلکہ ترکِ ضروریات۔ جیسے متضاد اور انتہا پسندانہ نظریات وجود میں آئے۔

دین اسلام نے جسم اور روح کے تقاضوں کو افراط اور تفریط سے بچا کر ایک حکیمانہ توازن اور اعتدال کی راہ دکھائی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے جسمانی افعال و اقوال ہماری روح کو متاثر بھی کرتے ہیں اور اس سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ ہمارے ظاہری افعال و اعمال ہماری باطنی یا روحانی کیفیت کے اسباب بھی ہوتے ہیں اور بعض دفعہ اس کی علامات بھی ہوتے ہیں۔ جسم اور روح کی اس تعلق اور ان کی فعالیت اور انفعالیت کی بنا پر دین اسلام نے جسم اور روح دونوں کی اصلاح اور فلاح کے لیے احکام دیئے ہیں۔ جن احکام کا تعلق ظاہری جسمانی اعمال کی درستی سے ہے اسے ہم فقہ یا ''فقہ الشریعۃ'' کہہ سکتے ہیں۔ اور جن امور کا تعلق اعمال کے باطنی اور روحانی پہلو سے ہے۔ اسے بقول سید ابوالحسن علی ندویؒ ہم ''فقہ الباطن'' سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

جس طرح جسم کی ظاہری صحت اور راحت مجملہ دیگر امور کے دراصل تو منحصر ہے اس کے اندرونی اعضا اور خصوصاً اعضائے رئیسہ مثلاً دل، دماغ اور جگر وغیرہ کی درست کارکردگی پر اسی طرح انسان کی روحانی یا باطنی صحت اور قوت کا سرچشمہ ہیں انسان کی تین لطیف باطنی استعدادات جنہیں اہل تصوف ''لطائف ثلاثہ'' سے تعبیر کرتے ہیں یعنی (۱) لطیفہ عقل (۲) لطیفہ قلب اور (۳) لطیفہ نفس۔

ان میں سے ''عقل'' ان علوم کا منبع اور مخزن ہے جن کو انسان حواس کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔ یعنی تجربہ اور مشاہدہ سے حاصل ہونے والا علم بلا عقل ہی کے ذریعے ان حقائق و معارف کا ادراک ہوتا ہے جن کے ادراک سے بعض

دفعہ، حواس قاصر رہتے ہیں۔ عقل کی صفات اور اس کے افعال ہی میں شامل ہے یقین، شک، توہم، ہر ایک واقعہ کا سبب تلاش کرنا اور حصولِ منافع یا دفع مضار کی تدبیریں سوچنا وغیرہ۔ لطیفہ عقل حواس کی مدد کا محتاج ہے۔ اور اگر حواس عقل کے ادراک کے لیے مواد بہم نہ پہنچائیں تو عقل کے معطل اور بے کار ہونے میں کچھ شک نہیں۔

دوسرا لطیفہ قلب (دل) ہے۔ جو حب اور بغض کا منبع ہے اور ارادہ و اختیار اس سے صادر ہوتے ہیں۔ نیز اس قلب کے ہی افعال اور صفات ہیں غضب اور جرات، بزدلی یا بہادری، بخل اور سخاوت، خوف و رجاء اور حب و بغض کے متعلق تلون کا مظاہرہ۔ بالفاظ دیگر تمام خیروشر کا اصل منبع اور مخزن یہی ''قلب'' ہے۔ اس پر مزید بات ابھی آگے آئے گی۔

تیسرا لطیفہ نفس ہے۔ یہ اس (استعداد) کا نام ہے جس میں مستلذات یعنی کھانے پینے کی لذیز اشیاء کی طلب اور جنسی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ نفس ان چیزوں کا حریص رہتا ہے۔ اور ویسے اس حرص کا ایک فائدہ بھی ہے کیونکہ بقول حضرت شاہ ولی اللہؒ نفس ہی ان امور کا تقاضا کرتا ہے جن کے بغیر ''ہیکل انسانی' یعنی فرد یا معاشرہ کا قائم رہنا محال اور ناممکن ہے۔ کھ نے پینے، سونے اور جنسی تعلق کے یہ تقاضے ہی انسان کی حیوانی زندگی کا دائرہ ہے۔ تاہم حیوانی زندگی کے تقاضوں اور ضروریات تک محدود رہ جانا یا صرف اسی زندگی کی آسائشوں کو ہی نصب العین بنالینا — مذموم کام ہے۔

یہ ہر سہ لطائف یعنی عقل، قلب اور نفس ایک دوسرے کی مدد اور اعانت کے محتاج ہیں۔ مثلاً ادراک عقل کا کام ہے اور غضب یا بغض و محبت کا منبع قلب ہے — اگر کوئی آدمی تلخ یا شیریں کلام یا وعظ و انداز کا ادراک ہی نہ کر سکے تو

Marfat.com

اس کے جذبات حب و بغض اور خوف و رجاء میں کوئی ہیجان پیدا نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر قلب کی اعانت شامل نہ ہو اور وہ اعضاء کو اپنے حسب ارادہ تصرف میں نہ لائے تو انسان کا اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تگ و دو کرنا ممکن نہیں ہے۔ یا یوں کہیے کہ جو بات دل میں نہ جمے یا جس بات پر دل نہ جمے مثلاً عقیدہ — تو اعمال میں اس کا اثر قطعاً ظاہر نہیں ہوگا۔

پھر یہ بات بھی تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ ان لطائف ثلاثہ کے تقاضے مختلف افراد میں جبلتہً یا عادتہً مختلف ہوتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے قلب (کے ارادہ) کو ان کے نفس (کی خواہشات) پر پورا تسلط حاصل ہوتا ہے۔ ایسے آدمی کو جب کسی اعلیٰ مقصد کی طلب پیدا ہوتی ہے تو وہ اس کے لیے بڑی سے بڑی نفسانی لذت کو بھی بلا تامل ترک کر دیتا ہے۔ یا مثلاً وہ بھوکا اور چیتھڑوں میں ہوتے ہوئے بھی اپنی عزت نفس کی خاطر کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتا اس کے برعکس بعض لوگوں پر نفس (کی خواہشات) کو کامل اقتدار حاصل ہوتا ہے اور ان کا قلب (یا ضمیر) ہمیشہ مغلوب رہتا ہے۔ ایسے آدمی اپنی کسی نفسانی خواہش کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ چاہے اس کے لیے کتنی ہی ننگ اور عار اس کو لاحق ہو — بعض افراد کی عقل ان کے قلب اور نفس پر غالب ہوتی ہے۔ ایسا آدمی ہر وقت اور ہر حال میں شریعت (اور قانون) کا متبع رہتا ہے۔ اور اس کے احکام سے سرمو انحراف نہیں کرتا۔ اسی طرح ہم یہ بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ انسانوں کے اندر ان تین استعدادات یا لطائف میں سے کسی وقت کسی ایک (لطیفہ) کا غلبہ ہوتا ہے اور کبھی کسی دوسرے کا۔

عقل، قلب اور نفس کے بارے میں یہ (مندرجہ بالا) دو امور ہیں جن کے اثبات (یعنی موجود ہونے) پر قریب قریب تمام مذاہب و ملت میں اتفاق ہے۔

بقول حضرت شاہ ولی اللہؒ ''ہر مذہب و ملت کے حکماء اور عقلاء جنہوں نے تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس کی بات کی ہے سب نے ان لطائف ثلاثہ کا اثبات کیا ہے یا کم از کم انہوں نے جن مقامات اور احوال کی تشریح کی ہے وہ ان ہی لطائف ثلاثہ کے نتائج اور ثمرات ہیں'' (حجتہ اللہ البالغہ)

صوفیہ کرام نے بھی ان لطائف ثلاثہ کا اثبات کیا ہے اور ان کی تہذیب پر اپنی توجہ مبذول کی ہے اور اس کے لیے بعض دفعہ انہوں نے اپنی اصطلاحات بھی استعمال کی ہیں۔ مثلاً جب کسی کے لطیفہ عقل میں ایسی نورانیت پیدا ہو جائے جس کی بدولت وہ ان باتوں کی تصدیق پر مائل ہوتا ہے جن کی تصدیق کرنا — یعنی جن پر ایمان لانا انسان پر فرض ہے — یعنی جب عقل صفائی اور پاکیزگی کے اس منتہائے کمال تک پہنچ جائے تو وہ (صوفیہ) اس کو عقل کی بجائے ''سر'' کہتے ہیں۔ اور جب قلب (دل) کی طہارت اور پاکیزگی منتہائے کمال کو پہنچ جائے تو وہ اسے قلب نہیں بلکہ ''روح'' کہتے ہیں اسی طرح جب نفس میں حیوانی تقاضے غالب ہوتے ہیں تو وہ اسے — قرآنی اصطلاح کے مطابق — نفس امارہ کہتے ہیں۔

اور جب انسان بہیمیت اور ملکیت کے خصال اختیار کرنے میں ڈانواں ڈول ہوتا ہے کہ کبھی نیکی کی طرف جھک جائے اور کبھی بدی کا پلڑا بھاری ہو جائے تو اسے وہ نفس لوامہ کہتے ہیں..... یہ بھی قرآنی اصطلاح ہے — برخلاف اس کے جب انسان کا نفس ہر طرح سے شرع کا پابند ہو اور وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کا کامل طور پر مطیع و منقاد ہو جائے اور کسی ایسی چیز کی طرف اس میں حرکت پیدا نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو — تو اس حالت میں وہ نفس مطمئنہ کہلانے کا مستحق ہے — اور یہ بھی قرآنی اصطلاح ہے۔ گویا اہل

Marfat.com

تصوف کے ہاں مطلوب و مقصود ''سر'' (یعنی کامل اور مہذب عقل)، ''روح'' (یعنی کامل اور مہذب قلب) اور ''نفس مطمئنہ'' (یعنی کامل اور مہذب نفس) ہیں۔

ان تین لطائف یا استعدادات کی تہذیب یا تطہیر و تزکیہ قرآن کریم کا ایک اہم موضوع ہے۔ قرآن کریم سب سے پہلے عقل انسانی کی تہذیب چاہتا ہے۔ یعنی ان لطائف ثلاثہ کی تہذیب و اصلاح کا کام ایمان باللہ سے شروع ہوتا ہے۔ جب عقل انسانی ایسے سچے عقائد کی تابع ہو جو سر چشمہ نبوت سے ماخوذ ہوں۔ یعنی جب آدمی اللہ تعالیٰ کے رسولؐ اور اس کی کتاب کی تصدیق کرتا ہے تو آہستہ آہستہ یہ ایمان اس کے قلب میں اُترتا ہے اور پھر اس کا قلب اور نفس بھی اس ایمان کے تابع ہو جاتے ہیں ور لطائف ثلاثہ میں سے ہر ایک پر اس کی استعداد کے مطابق عبودیت کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔

لطائف ثلاثہ کی تہذیب و اصلاح کا عمل عقل سے شروع ہونے پر دلالت کرتی ہیں وہ تمام — تمیں سے زائد — آیات قرآنی جو عموماً ''لآیات'' یا ''لآیة لقوم یعقلون'' یا ''افلا تعقلون'' یا ''لعلکم تعقلون'' کے الفاظ پر ختم ہوتی ہیں یا قرآن کے سوا کے قریب وہ آیات جن میں یا تو ''اولوا الالباب'' (عقل والوں) کو مخاطب کیا گیا ہے یا ان کی بعض صفات بیان ہوئی ہیں ... اور اس قسم کی تمام آیات میں بالعموم دعوت الی الحق کے دلائل ہیں اور جن کا نتیجہ ایمان باللہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

☆ عقل کا عام اقتضاء اسباب کی تلاش کرکے نتیجہ تک پہنچنا ہے۔ عام حالات میں انسان کی عقل بشری تقاضوں سے کام کرتی ہے اور وہ صرف ان امور کی تصدیق پر مائل ہوتی ہے جو اس کی طبیعت کے موافق ہوں۔ لیکن جب عقل کی تہذیب کر لی جائے تو پھر وہ ان تمام امور پر جن کی

بابت شارع نے خبر دی ہے اس طرح یقین کرتی ہے گویا آدمی ان کو عیاناً دیکھ رہا ہے۔ اس وقت اس پر "علی بصیرۃ" ہونے کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور اسی چیز کو بعض صحابہؓ کی طرف منسوب اس قول میں بیان کیا گیا ہے کہ ''اگر جنت اور جہنم یعنی بہشت اور دوزخ عیاں ہو کر ہمارے سامنے آجائیں تو ہمارے ایمان میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہم تو ''بالغیب'' ہی ان امور پر ''حق الیقین'' بلکہ ''عین الیقین'' کی طرح ایمان لاچکے ہیں عقل کی اصلاح اور تہذیب و تطہیر ہو جائے تو قلب اور نفس کا مہذب ہو جانا ناگزیر ہے۔

☆ اسی طرح قلب کا عام اقتضاء یہ ہے کہ آدمی کو اپنے محسن و مربی کے ساتھ محبت ہو۔ یا وہ نفع بخش چیزوں کا جویا اور خواہاں ہو اور جو چیز نقصان دیتی ہو اس سے خائف اور ہراساں رہے۔ جب قلب کی تہذیب کرلی جائے تو اللہ کی محبت اور ہیبت اور اس کے عذاب و ثواب سے خائف یا امیدوار رہنا اس میں رچ بس جاتا ہے۔

چونکہ قلب کا درجہ عقل اور نفس کے درمیان ہے اس لیے قرآن کریم میں انسان کی اکثر صفات کو اور اس کی اکثر افعال کو قلب کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔ بعض دفعہ عقل کے افعال کو قلب کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ مثلا "لھم قلوب لا یفقھون بھا" (الاعراف:۱۷۹) اور ".....فتکون لھم قلوب یعقلون بھا" (الحج:٤٦) اور کہیں نفس اور قلب ہم معنی استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً "واللہ یعلم ما فی قلوبکم" (الاحزاب:۵۱) اور "ربکم اعلم بما فی نفوسکم" (الاسراء:۲۵) گویا ایک طرح سے قلب کے بیان میں عقل اور نفس کا بیان بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ قلب کے احوال و عوارض

اور اس کی اصلاح و تہذیب اور اس کے تزکیہ و تطہیر پر قرآن کریم نے بہت زور دیا ہے۔

ایمان بھی کامل تب ہوتا ہے جب اقرار باللسان اور تصدیق عقلی سے بڑھ کر یقین قلبی کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس کیفیت کو قرآن کریم نے ایمان کے دل میں داخل ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ (الحجرات:۱۴)

قرآن حکیم کی مختلف آیات میں قلب (دل) کے روحانی عوارض کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً دل کا اندھا ہونا۔ "تعمی القلوب" (الحج:۴۶) دل میں حق سے نفرت ہونا یا اشمئزاز قلب (الزمر:۴۵) دل کی کجی یا زیغ قلب (آل عمران:۷ اور کئی دیگر مقامات پر) دل کا غفلت میں مبتلا ہونا (الکہف:۲۸) دل کا سخت ہونا یا قساوۃ قلب (مثلاً الزمر:۲۲، الحدید:۱۶ اور دیگر مقامات پر) دل کی نادرستی یا روگ یعنی مرض قلب (جس کا ذکر البقرۃ:۱۰ کے علاوہ بارہ دیگر مقامات پر ہوا ہے)۔ دل پر مہر لگ جانا یعنی ختم یا طبع علی القلب (مثلاً الجاثیہ:۲۳، البقرہ:۷، التوبہ:۹۳ اور دیگر مقامات پر) دل پر میل یا زنگ آنا یعنی رین قلب (المطففین:۱۴) دل پر قفل پڑنا (محمد:۲۴) دل میں غیر اسلامی غیرتوں کا جاگزیں ہونا یعنی "حمیة الجاهلية" (الفتح:٢٤) وغیرہ وغیرہ۔

ان جملہ عوارض سے آگاہ ہونا اور ان سے دور رہ کے اپنے قلب کی حفاظت اور اصلاح کی کوشش کرنا اسلام کے روحانی نظام کا ایک اہم پہلو ہے۔

ان عوارض سیئہ کے مقابلے پر اسلام کا مطلوب و مقصود "قلب سلیم" ہے (الشعراء:۸۹) یعنی ان سب عوارض سے پاک اور صحیح و تندرست قلب۔ ایسے ہی دل کو قرآن حکیم میں (اللہ کی طرف) جھکنے والا دل یعنی "قلب منیب" (ق:۳۳ اور دیگر جگہوں پر) کہا گیا ہے۔ تقویٰ کو (جو ہدایت قرآنی کا مطلوب و مقصود

Marfat.com

ہے) دل کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے۔ یعنی تقوی القلوب (الحج :۳۲ اور الحجرات:۳ میں) قلب (دل) کی اصلاح اور تطہیر کے عوامل یا نتائج کے بارے میں قرآن مجید نے حسب ذیل امور کا خصوصاً ذکر کیا ہے۔ دل میں ہیبت الٰہی کا پیدا ہونا "وجلت قلوبهم" (الانفال:۲) اور "قلوبهم وجلة" (المومنون:۶۴) دل میں عاجزی اور نرمی پیدا ہونا جسے اخبات، خشوع اور لینہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مثلاً (ھود:۲۳ اور الحج :۳۴ و ۵۳ پر) اور (الاحزاب:۳۵ اور الاسراء:۱۰۹ پر) اور (الزمر:۲۳ پر) اسی طرح دل کا درست راستے پر پڑنا یا ہدایت پانا (التغابن:۱۶ میں) اور دل کا اطمینان و سکون کی دولت سے مالا مال ہونا (الرعد:۲۸) وغیرہ وغیرہ۔

مجموعی طور پر قرآن کریم کی سو سے زائد آیات کا موضوع قلب انسان ہے۔ اس لیے اسلام کے روحانی نظام میں سب سے زیادہ زور اسی "قلب" کی اصلاح پر دیا گیا ہے۔ حدیث شریف میں بھی اسی "مضغۂ قلب" کی صلاح اور فساد کے ساتھ پورے روحانی فساد و اصلاح کو وابستہ کیا گیا ہے۔

خیال رہے کہ قلب یا دل انسانی جسم کے اندر صنوبری شکل کا ایک (مشہور) عضو ہے جو بدن میں جریان و دورانِ خون کا ذمہ دار ہے۔ قرآن کریم میں علم افعال الاعضاء کی رو سے اس قلب کے "وظائف کا بیان نہیں ہوا ہے" بلکہ منبع خیر و شر ہونے کی حیثیت سے اس کی کیفیات کا ذکر ہے۔ جس طرح انسان کی جسمانی موت و حیات کا انحصار قلب (دل) پر ہے۔ اسی طرح قرآن مجید نے انسان کی روحانی موت و حیات کا مرکز اسی قلب کو ٹھہرایا ہے۔

حدیث شریف میں اسے مضغۂ (لوتھڑا) اور قرآن مجید میں — "القلوب التی فی الصدور" (دل جو سینوں کے اندر ہیں) کہہ کر بظاہر

Marfat.com

اسی قلب نامی جسمانی عضو کا ذکر کیا گیا ہے تاہم بات اس کے جسمانی اور عضوی حیثیت کی نہیں بلکہ روحانی افعال و احوال کی ہوئی ہے جو اس وقت زیر مطالعہ موضوعِ بحث ہیں۔

☆ تیسرے لطیفہ یعنی نفس کا طبعی اقتضاء تو اس کا امارہ ہونا ہے۔ وہ شہوات انسانی کے پورا کرنے میں منہمک رہتا ہے اور آرام طلبی کا بھی خواہاں ہوتا ہے۔ لیکن جب اس کی تہذیب کرلی جاتی ہے تو وہ تائب ہو کر زہد اختیار کرلیتا ہے اور آرام طلبی کی بجائے جدوجہد اس کی صفت بن جاتی ہے۔ نفس کے تزکیہ میں ہوائے نفس (خواہشات) کی مخالفت کو بڑا دخل ہے۔ قرآن کریم میں فلاح کو تزکیہ نفس سے وابستہ کیا گیا ہے۔ ''قد افلح من زکھا'' (الشمس:۹) اور مخالفت نفس کو باعث دخول جنت کہا گیا ہے۔ (النازعات: ۴۰، ۴۱) مولانا اشرف علی تھانوی نے کسی جگہ لکھا ہے کہ:

''وہ ذرا سی بات جو حاصل ہے تصوف کا۔ یہ ہے کہ جس اطاعت میں سستی ہو، سستی کا مقابلہ کرکے اس اطاعت کو بجا لائے اور جس گناہ کا تقاضا ہو اس تقاضے کا مقابلہ کرکے اس گناہ سے بچے۔ جس کو یہ بات حاصل ہو گئی اس کو پھر کچھ بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہی بات تعلق مع اللہ پیدا کرنے والی ہے اور یہی اس کی محافظ ہے اور یہی اس کو بڑھانے والی ہے۔''

ہم نے ابھی اوپر بیان کیا کہ ان لطائف ثلاثہ (عقل، قلب اور نفس) کی تہذیب کے پروگرام کی ابتداء ''ایمان باللہ'' یا عقل کی تہذیب سے ہوتی ہے۔ لیکن اس ''ایمان باللہ'' کو ''اتصال باللہ'' اور ''تعلق مع اللہ'' میں کیسے بدلا جائے اور قلب و نفس پر ایمان کا یہ رنگ کیسے چڑھایا جائے؟ اور کس طرح ان لطائف

ثلاثہ میں ایک ہم آہنگی Hormony پیدا کی جائے؟ — ان چیزوں کے بارے میں اہل تصوف نے تو بہت کچھ لکھا ہے — تاہم ایک تو وہ اپنی مخصوص زبان اور اصطلاحات میں بات کرتے ہیں اور آج کل تو وہ بھی نہیں رہا اور تصوف بعض مخصوص مفادات (Vested Interests) کے چند مخصوص نعروں یا ادعاءات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ الا ما شاء اللہ — دوسرے یہ کہ صوفیہ نے بھی روحانی تزکیہ کے لئے جو قواعد و اصول بیان کئے ہیں ان کی اصل قرآن کریم اور اس کا بیان سنت رسولؐ میں موجود ہے۔ (اور جس نام نہاد تصوف کی بنیاد اور اساس قرآن و سنت نہیں وہ تصوف نہیں گمراہی ہے)۔ اس لئے ہم بھی ان موضوعات کے بارے میں جب قرآن حکیم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید کی بیسیوں آیات اسی روحانی نظام کے کسی نہ کسی پہلو (Aspect) سے تعلق رکھتی ہیں۔

ایمان باللہ (جس میں توحید، رسالت، آخرت سب شامل ہیں) تقویم باطن کی طرف پہلا قدم ہے۔ اس کے بعد عمل صالح کا میدان شروع ہوتا ہے جس کی پہلی منزل عبادت ہے۔ جس کے ذریعے عبودیت کا نور لطائف ثلاثہ میں سرایت کر کے اپنا اثر دکھاتا ہے — عبادات کے ساتھ ساتھ اسلام تہذیب اخلاق پر زور دیتا ہے — اور فضائل و رذائل اخلاق کا بیان کتاب و سنت کا ایک اہم موضوع ہے جس پر مستقل تالیفات موجود ہیں — یہاں تک اپنے ظاہر کو اسلامی تعلیمات کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا کام مکمل ہوتا ہے۔

لیکن اللہ کے ساتھ اپنے اس تعلق کو ترقی دینا اور اپنی روحانی اور باطنی کیفیات پر عبودیت کا گہرا رنگ چڑھانے کے لئے قرآن کریم نے جن امور پر زور دیا ہے اور جسے صوفیہ اور مفسرین نے اپنے اپنے رنگ میں بیان کیا ہے وہ

Marfat.com

حسب ذیل امور ہیں:۔

۱۔ذکر اللہ ۲۔حب اللہ ۳۔خشیۃ اللہ ۴۔استغفار ۵۔التوبۃ الی اللہ ۶۔شکر ۷۔توکل ۹۔اخلاص نیت ۱۰۔دُعاء اور ۱۱۔ ان سب پر حاوی اور ان میں جاری و ساری — اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم —

اسلام کے روحانی نظام کی قرآنی بنیاد ان ہی موضوعات پر استوار ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک ایک موضوع پر قرآن و سنت کی روشنی میں لکھا جاسکتا ہے اور لکھا گیا بھی ہے۔ لہذا ہم یہاں ان موضوعات پر عنوانات کی طرف اشارہ کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں اور آخر پر صرف اس طرف توجہ دلا کر یعنی عقل، قلب اور نفس شریک ہوتے ہیں اور نماز کے ذریعے علی قدر استعداد ہر ایک کی تطہیر تہذیب ہورہی ہوتی ہے۔ اسی لئے نماز کو "معراج المومنین" کہا گیا ہے۔ ساری روحانیت کی ابتداء بھی یہی ہے اور انتہا بھی یہی ہے — اور مندرجہ بالا تمام گیارہ امور بھی اجمالاً سب کے سب نماز میں شامل ہیں۔

Marfat.com

4. Al-Namal (27) / 91-92
5. Al-Isra' (17) / 106
6. Al-A'raf (7) / 204
7. Sad (38) / 29
8. Muhammad (47) / 24
9. Al-Mu'minun (23) / 68
10. Al-A'raf (7) / 3
11. Al-Zumer (39) / 55
12. Al-Qiyamah (75) / 18
13. Al-Ahzab (33) / 2
14. Al-Baqarah (2) / 63
15. Al-Zakhraf (43) / 43
16. Al-Ma'idah (5) / 48
17. Al-Ma'idah (5) / 49-50
18. Al-Ma'idah (5) / 44
19. Al-Ma'idah (5) / 45
20. Al-Ma'idah (5) / 47
21. Al-Ma'idah (5) / 65

Marfat.com

(ii) "Who is better than Allah for judgement to a people who have certainty (in their belief)". (17).

(iii) "Who so judgeth not by that which Allah has revealed, such are disbelievers". (18)

(iv) "Who so judgeth not by that which Allah has revealed, such are wrong doers". (19)

(v) Who so judgeth not by that which Allah has revealed, such are unbelievers". (20)

5. Finally we have been asked to preach the Qur'an and to spread its message and teachings:-

(i) "O messenger of Allah : Make known that which hath been revealed unto thee from thy Lord". (21).

Thus, to sum up, our duty towards the Qur'an is to read and recite and listen to its recital, to know and understand its contents, to follow its teachings, to enforce its laws, and last but not the least to preach its message to humanity which really needs it today more than ever.

References

1 Al Muzzammil (73)/4
2 Al Isra' (17) : 78
3 Al 'Ankabut (29) : 45

Marfat.com

chastisement comes on you suddenly when ye know not". (11)

(iii) "And when We read it, follow thou the reading". (12)

(iv) "And follow that which is revealed unto thee from thy Lord". (13)

(v) "Hold fast that which We have given you and remember that which is therein". (14)

(vi) "So hold thou fast to that which is revealed to thee, Lo! Thou art on a right path". (15).

4. It is also our duty, as Muslims, to make all our decisions and judgements according to the Qur'an. All disputes should be settled, and cases decided, on the authority of the Qur'anic Law. The Qur'an has given us civil as well as penal laws, which should be enforced when Muslims are at the helm of affairs in a state. Indeed it is the only way of administering the justice, and deviation from the Qur'anic Laws is defiance of the Divine Law, which leads to injustice and amounts to disbelief and infidelity. A study of the following verses brings home this point:-

(i) "So judge between them by that which Allah has revealed and follow not their desires but beware of them, lest they seduce you from some part of that which Allah has revealed unto thee". (16).

Marfat.com

step towards the performance of our next duty towards the Qur'an. In the next stage, the Qur'an asks us to ponder over its verses, to meditate on its meanings, and to try to have a sound understanding

of its contents. The following verses emphasise the point:-

(i) "(This is) a Scripture that we have revealed to you full of blessing, that they may ponder over its revelations, and that men of understanding may reflect". (7)

(ii) "Will they then not meditate on the Qur'an or are there locks on the hearts?" (8).

(iii) "Have they not pondered the Word?" (9).

So we should, not only, be able to read the Qur'an correctly, but also should try to understand it.

This pondering and meditation on the Qur'an does not mean merely a mental pleasure. Next we are enjoined upon to follow the Qur'an. We should tread the path laid down by the Qur'an and submit to its orders and injunctions in day to day life. We should subjugate and surrender ourselves completely to the Qur'anic commandments.

(i) "Follow that which is sent down unto you from your Lord, and follow no protecting friends beside Him". (10)

(ii) "And follow the best (guidance) which is revealed to you from your Lord, before the

Marfat.com

(vi) "And say I am commanded to be of those who surrender (unto Him) and to recite the Qur'an". (4)

(v) "And (it is) a Qur'an that we have divided (into distinct parts), so that you may recite it to mankind at intervals, and we have revealed it by stages (or in portions)". (5)

(vi) "And when the Qur'an is recited, give ear to it and Pay heed, that ye may obtain mercy." (6)

As a result of such injunctions, the Qur'an has been, and is the most widely read book of the world. It is read and recited even by millions of such people who do not understand it and who, perhaps, cannot even read or write their own mother tongue; but they recite the Qur'an with such an accurate punctuation, as if they understand every word of it. Every Muslim child is made, and should be made, to learn the recitation of the Qur'anic text. Learning the Qur'an at an early stage helps the child a lot in acquiring the correct Qur'anic pronunciation. Some good Muslims go a step further, and persuade their children, or at least some of them, to memorize the Qur'an. This practice of memorizing the whole of the Qur'anic text is, not only, a wonderful system for the preservation of the Qur'anic text, but is also a very effective measure to ensure the correct reading of the Qur'an, with correct pronunciation and correct punctuation.

2. Reading and reciting of the Qur'an, though very important, is not an end itself. It is the preliminary

Marfat.com

opportunity to ponder over the fact that, slowly but continuously we have been drifting away from the Qur'an for a period of 14 centuries. It is a good omen that the Muslims, every where, have begun to remember that the panacea for all their ills lies in going back to the Qur'an. We should, therefore, devise means and measures to fill up this gap of the negligence of 1400 years, and to speed up our march towards the Qur'an to make up the losses.

For this purpose we should, in the first instance, know what duty we owe to the Qur'an itself. We, the Muslims, accept the Qur'an as the Word of Allah. This belief in itself is sufficient to signify the importance of the Qur'an for us. It means that every word of the Book is to be taken very seriously. It is not just a rare relic, to be kept in some museum under lock and key. It is a book which itself lays down the duties of the believers towards itself. Let us see, in the light of the Qur'an itself, what these duties are?

I. First of all, the Qur'an enjoins upon us, the believers, when to read it (the Qur'an) again and again, and to listen to it being recited. The following verses clearly lay down this duty:-

(i) "And chant the Qur'an in measure." (1)

(ii) "And (establish) the recital (of the Qur'an) at dawn. Lo! the recital of the Qur'an at dawn is ever witnessed". (2)

(iii) "Recite that which hath been revealed to thee of the Scripture". (3)

Marfat.com

OUR DUTY TOWARDS THE QUR'AN

This (*Hijri*) year the Muslim world is celebrating the 1400th anniversary of the Revelation of the Qur'an (*Nuzul-ul-Qur'an*). Seminars, conferences and meetings are being held, useful literature and special issues of newspapers are being published to propagate the message of the Qur'an.

In fact, celebration of the Nuzul-ul-Qur'an Anniversary is not a new idea. We, the Muslims, celebrate it annually in the month of *Ramadan*, the month during which the first revelation of the Qur'an came to the Holy Prophet. During the month of *Ramadan* we come nearer to the Qur'an, nearer to its letter as well as its spirit. We spend our days in fasting. This is the best preparation for imbibing the spirit of the Qur'anic teachings. During nights the Qur'an is recited and listened to in *Tarawih* prayers. Thus having refreshed our knowledge and understanding of the Qur'an, we celebrate *Eid-ul-Fitr*, in commemoration of the revelation of the Book of Allah.

The idea of celebrating the 1400th anniversary of *Nuzul-ul-Qur'an* does not add anything new to the importance of the Qur'an. The Qur'an is as important and great a book today as it was a thousand years ago, and as it will be a thousand years hereafter. However, there are, at least, two points of significance about these celebrations. Firstly, the Qur'an is the only revealed book whose original text has remained pure and safe from additions or omissions, whatsoever, for such a long period. Secondly, we Muslims, should take this ceremonial celebration as an

Marfat.com

References

1. Al-Nisa` (4) / 145
2. Al-Baqara` (2) / 44
3. Al-Shu`ara` (26) / 224 - 227
4. Al Imran (3) / 188
5. Al-Saf (61) / 2 - 3

Marfat.com

Mere imagination and idle talk does not matter any thing if one's actions and deeds do not conform to his sayings and utterance.

4. Another verse of the Qur'an describes the habits as definitely punishable.

"Think not that those who exalt in what they have done, and love to be praised for what they have not done think not, they are in safety from the doom, a painful doom is theirs." (4)

5. The Qur'an, in unequivocal terms, enjoins upon its followers that their word and deed must always go together.

"O ye who believe! Why say ye that which ye do not (practise)? It is most hateful in the sight of Allah that ye say that which ye do not (practise). (5)

The world has had much of ideal talking and ideal thinking. It is the ideal action and deed which we lack so miserably, which the humanity needs so badly, which the Holy Qur'an emphasizes upon so vehemently, and which the Muslims must comply with earnestly and sincerely. We, the followers of Islam, should not therefore, merely talk about, but should, in all earnestness, try to tread the path of truth in the light of Islam.

Marfat.com

1. It is to be noted that hypocracy i.e., wilful double facedness or maliciously planned dichotomy, is nothing but mere disbelief rather the worst part of it. About the people involved in this vice the Qur'an says: "Lo! the hypocrites (will be) surely in the lowest depths of the Fire, and thou wilt find no helper for them." (1).

2. The Qur'an, while discussing the debased character of the Jews, points out that this evil i.e. dichotomy of word and deed was common among them. In an adress to Jews the Qur'an says:

"Do ye enjoin righteousness upon mankind, while ye yourself forget (to practice it), and ye are readers of the scripture. Have ye then no sense?" (2)

No doubt, the verse condemns this debasement in character, of which, the Jewish morals, in those days, were one example and illustration. Equally condemned are all those who may acquire this trait and to whom this verse may apply.

3. Commenting on the evil and unhealthy aspects of poetry, the Qur'an describes the poets as persons, who practically do not mean what they say or perhaps they say what they do not mean.

"As for the poets, it is those straying in vil who follow them. Hast thou not seen how they stray in every valley, and that they say that which they do not (practise), except those who believe and do good works and remember Allah much." (3)

MORAL EXCELLENCE

One of the main points, which the Holy Qur'an emphasizes, is the development of human personality on the basis of a very strong and sound moral character. The Quranic injunctions and prohibitions, primarily, aim at raising the standard of righteousness in its followers. According to the Qur'an, the bedrock of all good character is *Taqwa* (piety or self-discipline through fear of God). With this basis, the Qur'an further explains all the "dos" and "do'nts", which are to be carefully observed for achieving a high standard of moral perfection and strong character. Here we are going to discuss one of the important "do'nts" of the Qur'an.

The Holy Qur'an asks its followers, emphatically and in very explicit terms, to avoid dichotomy in conduct and behaviour. There should be no duality in word and deed, no discrepancy in thought and action no division of private and public life. It is the action, and not mere "acting " that counts and weighs. Unfortunately, dichotomy, the canker of character and the worst enemy of moral excellence, has become a rule of the day in our present society. At every level of human behaviour, from the individual level to the international one, dichotomy is being adopted widely as a measure of wisdom and polity. It is the bitter experience of this vice all around us which makes one think that perhaps all the loud talk about moral elevation is nothing but a fallacy or a farce.

Now let us see how the Holy Qur'an has viewed this human weakness. This forms one of the vital aspects of the Qur'anic teachings about ideal moral character.

Marfat.com

Marfat.com

Qur'án wa-Sunnat

Chand Mabahith-2

Marfat.com

قرآن وسنت

چند مباحث ۲

حافظ احمد یار خانؒ

شیخ زاید اسلامک سینٹر، جامعہ پنجاب، لاہور